مہا اوکھا مفتی
18600
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
مرتب: عکسی مفتی

مہا اوکھا مفتی

مہا اوکھا مفتی

مرتب
عکسی مفتی

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست

ممتاز مفتی کا فن:

شخصیت:

انٹرویو:

-☆-

ممتاز مفتی نے بہت لکھا ڈرامے، کہانیاں، ناول، شخصیات، سفرنامہ اور سوانح حیات۔ لیکن ایک بہت بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ اردو زبان کو روایتی بندھنوں سے آزاد کرنا تھا۔ اُن کی اس خدمت کا اعتراف انجمن ترقی اردو نے بھی کیا اور انہیں اس کی طرف سے انعام اور شیلڈ سے نوازا گیا۔

کوئی شاعر اور ادیب انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا جس کا خاکہ نہ لکھا ہو، حد یہ کہ خود اپنا تخصی خاکہ بھی لکھ ڈالا، لکھنے میں اُن کا اپنا ایک انداز اور اپنا ہی نقطۂ نظر تھا۔ اب اُن کے فن و شخصیت پر لکھنے والے انہیں اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھ کر لکھ رہے ہیں۔ نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت میں بھی اردو ادب کے طالب علم اُن پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

ہماری کوشش اور خواہش ہے کہ ممتاز مفتی کی تمام غیر مطبوعہ تحریریں، اُن کی ذاتی ڈائریاں، اہم خطوط اور غیر مطبوعہ ڈرامے جلد از جلد ترتیب دے کر شائع کر دیئے جائیں۔ اُن کا یہ ادبی خزانہ علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور ادب کے طالب علموں کی امانت ہے جسے جلد از جلد ان تک پہنچنا چاہیے۔

ادارہ

ممتاز مفتی ٹرسٹ

☆

اپنی بات

''مہا اوکھا مفتی'' یہ نام میں نے تجویز کیا ہے۔ ہر باپ اپنی اولاد کی نظر میں اوکھا ہی ہوتا ہے، مگر مجھے ممتاز مفتی کی وفات سے قبل بالکل اندازہ نہ تھا کہ میرا باپ دنیائے ادب کا اوکھا ترین شخص ثابت ہوگا۔ یہ بات میرے لیے حیرانی کے ساتھ ساتھ دلچسپی کا باعث بھی بنی کہ ایسا کیوں ہے؟

ممتاز مفتی کی موت سے جہاں نصف صدی پر محیط اردو ادب کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا وہاں اُن کی موت کے بعد مجھ پر حیرت، تجسس اور آگاہی کے اتنے در کھلے، اُن کی شخصیت کی اتنی تہیں کھلیں جو اس سے قبل میری نظروں سے اوجھل تھیں۔ اُن کی موت پر ایسے ایسے لوگ مجھ سے تعزیت کے لیے آئے کہ میں حیران رہ گیا کہ ان لوگوں کا بھلا ممتاز مفتی سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

میں جو ہر بات کو سائنسی اصولوں پر پرکھنے اور حقیقت کی نظروں سے دیکھنے کا عادی ہوں، ممتاز مفتی کی زندگی میں جن باتوں کو شدت سے ردّ کرتا رہا آج خود اُن سے دوچار ہوں۔

اُن کے چاہنے والے جانے کہاں کہاں سے آج بھی میرے پاس آجاتے ہیں، بے شمار خط آتے ہیں بے پناہ عقیدت سے بھرے ہوئے، کچھ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے دُعا کریں، کوئی لکھتا ہے ہم سچ بولنا چاہتے ہیں۔ اکثر لکھتے ہیں کہ ہم نے ممتاز مفتی کو خواب میں دیکھا، اور ساتھ ہی خواب کی لمبی تفصیل۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ ممتاز مفتی نے کس طرح پوری زندگی اس سیلاب کو روکے رکھا

جس کا رُخ اب میری طرف ہے اور جس کا اُن کی زندگی میں مجھے علم ہی نہیں تھا۔

ممتاز مفتی میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ بظاہر بڑے غیر منظّم آدمی تھے، اُن سے ملنے اور اُن کا ظاہر دیکھنے والے یہی تاثر لے کر جاتے مگر وہ اپنے معاملات میں بڑے منظّم تھے۔ آنے جانے والے خطوط کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنا، مسودوں کی ترتیب، پبلشروں کے ساتھ معاملات، کونسی کہانی چھپ گئی کونسی نہیں، حلقہء احباب اور پرستاروں کا تمام ریکارڈ اور اُن سے باقاعدہ خط و کتابت، یہ کام وہ اتنی باقاعدگی اور ترتیب سے کرتے تھے کہ اُن کا ظاہر دیکھنے والا کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ اپنے ہر عمل کا حساب کتاب رکھنا، روزانہ آنے والے ڈھیروں خطوط کا جواب دینا۔ ملاقاتیوں سے ملنا اور روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنا، یہ اصول انہوں نے آخر دم تک اپنائے رکھا۔

روایت سے بغاوت اُن کا خاصہ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بغاوت اُن کے خمیر میں رکھ دی گئی تھی۔ پہلی بغاوت انہوں نے اپنے باپ کے خلاف کی۔ مگر یہ تو مجھے اُن کی موت کے بعد علم ہوا کہ اُن سے زیادہ روایتی آدمی کوئی تھا ہی نہیں۔ بغاوت کرنے والے شخص سے لوگ اتنی محبت کیسے کر سکتے ہیں۔ اصل میں اُن میں بغاوت تھی ہی نہیں۔

گذشتہ سال لاہور میں اُن کی برسی کی پُر ہجوم تقریب میں کسی نے اُن پر مضمون پڑھتے ہوئے کہا "یہ پہلا آدمی ہے جسے مرے پانچ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر حیرت ہے اب بھی اُس کی برسی میں اتنے لوگ اکٹھے ہو گئے۔"

میں اُن کی زندگی میں انہیں سمجھ نہ سکا۔ اُن کی موت کے بعد سب بدل گیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ شخص جو "اوکھے لوگ" اور "اوکھے اولڑے" لکھ گیا دراصل خود سب سے بڑا اوکھا آدمی تھا۔

عکسی مفتی

جنوری ۲۰۰۲ء

-☆-

باربرامیٹکاف
ترجمہ: مسعود قریشی

ممتاز مفتی، ایک اسلامی طنز نگار

باربرامیٹکاف اپنے مقالے میں اس مفروضے پر شک کا اظہار کرتی ہیں کہ اسلام مذہبی روایت پسندی پر طنزیہ اظہار کا سخت مخالف ہے اور اسے برداشت نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں وہ اردو کے ادیب ممتاز مفتی کی تصنیف ''لبیک'' کا جائزہ پیش کرتی ہیں۔

''لبیک'' حج کی روداد ہے اور ۱۹۷۵ء میں اولین اشاعت کے بعد اس کے ایڈیشن مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔

''لبیک'' جیسی کتاب اسلام کی تضحیک یا اس سے انحراف کے حالیہ شوروغوغا میں ہمیں یاددہانی کراتی ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی تاریخ واضح تفسیری اجتہاد اور اختلافِ رائے سے بھری پڑی ہے۔ فریضہء حج کی ادائیگی کے رپورتاژ میں تصورِ اسلام کے بارے میں انفرادی امیج تلاش کرنا بظاہر کارِلا حاصل معلوم ہوتا ہے لیکن ''لبیک'' کے مصنف کا خود اعتراف ہے کہ وہ برائے نام مسلمان اور ملائیت کے خلاف ہے۔ بہت بڑی اکثریت دورِ حاضر میں مفتی کو اردو ادب کا بہترین ناول/افسانہ نگار قرار دیتی ہے۔ اُس کی یہ تصنیف غیر روایتی انداز اور تصوراتی سراب لیے ہوئے ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور اور تخلیقی انفرادیت کی حامل ہے۔ ممتاز مفتی ادھیڑ عمر کا پاکستانی ہے۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اپنے ایامِ جوانی میں برٹرینڈ رسل، جولین ہکسلے اور ہالڈین کے تصوراتی فلسفے سے اُس کی ذہنی تربیت ہوئی۔ لبیک میں اُس کا ملائیت کے خلاف رویہ نمایاں ہے لیکن جس اسلامی ماحول میں اُس کی پرورش ہوئی اس دور کی اسلامی روایت کی جھلکیاں بھی اس میں ملتی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ حج کے تاثرات کے بیان میں بہت سے لکھنے والوں نے وقت

سے ماوراز ہد و تقویٰ کی روایتی تکرار کی بجائے حالیہ دور میں اسے مختلف النوع ثقافتی رشتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ ان ثقافتی تقاضوں میں سب سے زیادہ اہم قدیم و جدید کی کشمکش ہے، یعنی لاہور اور لندن، مشرق اور مغرب، یقین اور شک، روحانی اور مادی عناصر وغیرہ کا باہمی تضاد۔ اس نئے عالمی شعور میں شرکت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ادیب مغرب میں قیام پذیر ہو، اس کے لیے لاہور بھی موزوں مقام ہے۔ ان مسائل پر بحث واضح یا مبہم مختلف صورتوں میں جا بجا ملتی ہیں بلاشبہ ادیب کے لیے یہ اہم ہے کہ وہ ان کے اظہار کے لیے کس ہیئت کا انتخاب کرے۔ ممتاز مفتی نے اس اظہار کے لیے سفرِ حج کے بیان کا انتخاب کیا ہے۔

(جسے وہ معصومیت سے رپورتاژ کہتا ہے) یہ رپورتاژ طلسماتی حقیقی ناول سے ڈرامائی طور پر مختلف ہے۔ سفرِ حج کے بیان کے انتخاب سے یہ تاثر ضرور ملتا ہے کہ ادیب کسی نہ کسی صورت میں اسلام سے وابستگی کا طالب ہے۔ اظہار رپورتاژ کی صورت میں ہو یا طلسماتی حقیقتوں پر مبنی ناول کی صورت میں، دونوں اصناف میں متصور تضادات اور جدید دور کی زندگی کی بوالعجبیوں کے کھوج کے امکانات موجود ہیں۔ دونوں اصناف اس بنیادی جدید رویے کی حامل ہیں کہ ثقافتی حقائق کی متضاد تشریح ہو سکتی ہے۔ سفر متبادل تصورات اور طنز کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے کیونکہ سفر کے دوران مانوس ماحول سے مختلف ماحول ملتا ہے اور توقعات اور حقیقت کا بُعد نمایاں ہوتا ہے۔

ایک بہت نامور تصنیف کی حیثیت سے جب ''لبیک'' پاکستان میں ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تو اس کا نوٹس لیا جانا ایک لازمی امر تھا چنانچہ اس پر تبصرے ہوئے جو تمام کے تمام تعریفی نہیں تھے۔ کچھ مبصر ایسے تھے جنہوں نے اس وجہ سے اس کی مذمت کی کہ اس میں اسلام کے بارے میں بات کرتے ہوئے مصنف معقولیت کی حد سے آگے نکل گیا ہے۔ یہ کوشش بھی کی گئی کہ حکومت اس پر پابندی عائد کر دے لیکن ایک ناقد نے کفر کے لفظ کو الٹتے ہوئے کہا کہ اس قدر اعلیٰ ادبی معیار کی کتاب پر پابندی عائد کرنا ''کفر'' ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ معنی خیز بات یہ ہے کہ اُس وقت کے وزیر مذہبی امور نے جو کسی وقت بنیاد پرست

اسلامی جماعت کے رکن تھے اور خود بھی ادیب ہیں، اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہا کہ صرف یہ تصنیف مصنف کے بہشت میں جانے کا باعث ہو گی۔

مفتی کا کہنا ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے درمیانی عرصے میں اُسے کچھ ایسے عجیب واقعات پیش آئے جو نا قابلِ توضیح تھے۔ ان سب کا انجام اُس کا سفرِ حج تھا۔ اس روداد کا آغاز اس کہانی سے ہوتا ہے کہ ایک شام مفتی ایک چوک پار کر رہا تھا تو ایک سیاہ فام شخص جس کے چہرے پر خشونت تھی، بال الجھے ہوئے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں دفعتاً اُسے مخاطب کر کے چلّانے لگا:

''تم حج پر جاؤ گے، تم حج پر جاؤ گے''

اُسے بھکاری سمجھتے ہوئے مفتی نے کچھ خیرات پیش کی لیکن خلافِ توقع اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نقدی نکالتے ہوئے کہا:

''یہ لو تمہیں حج پر نقدی کی ضرورت پڑے گی''

اسی قسم کے دیدہ و متصورہ واقعات غیر محسوس طریقے سے اس بیان میں آتے چلے گئے ہیں۔ آخر کار کراچی سے جدّہ جانے والے پی آئی اے کے جہاز میں مفتی آدھی رات کے وقت اکانومی کلاس میں سوار ہو چکا ہے۔ اردگرد زائرین کا ہجوم ہے۔ وہ سب احرام میں ملبوس ہیں، چہروں پر عبادت کا عجز ہے اور ہاتھ تسبیح کے دانوں کو گردش دے رہے ہیں۔ اسی جہاز کے درجۂ اوّل میں پاکستان کی ہاکی ٹیم کہیں میچ کھیلنے کے لیے جا رہی ہے، کھلاڑی کبھی کبھی قہقہے لگاتے ہیں۔ مفتی کے ذہن میں ایک تصور اُبھرتا ہے جیسے کہ ہاکی ٹیم ہائی جیکرز ہیں جنہوں نے زائرین کا جہاز اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اُن کے قہقہے اپنے منصوبے کی کامیابی پر خوشی کا اظہار ہے پھر ایک دوسرا تصور اُبھرتا ہے مفتی جدہ میں مغربی انداز کے ایک عالی شان ہوٹل میں مقیم ہے، جہاں تمام جدید سہولتیں اور آسائشیں مہیا ہیں۔ وہ اپنے اس تصور کا مذاق اڑاتا ہے۔ عازمِ حج کی حیثیت سے ریگزاروں اور اونٹوں کے بارے میں سوچتا ہے کہ اُس کے ذہن میں ہوٹل کا کمرہ ایک حجلۂ عروسی میں بدل جاتا ہے جہاں ایک دراز گیسو طویل قد حسینہ داخل ہو کر "Hi" کہتے ہوئے اُس کا استقبال کرتی ہے۔

حیرت اور تصور کا یہ تسلسل حرمِ کعبہ میں اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ سنگِ مرمر کے بیرونی احاطے سے گزرتے ہوئے مفتی جذباتِ عقیدت و عبادت کے فقدان پر فکر مند ہے کہ اُس کی نظر حرمِ کعبہ کی چھت پر پڑتی ہے۔ پتھر کی یہی سادہ اور باوقار عمارت اس سفر کی منزل ہے۔ وہاں مفتی ''کسی'' کو جھانکتے دیکھتا ہے۔ نادیدہ چہرے کی نظر مفتی پر پڑتی ہے۔ اس نظر میں طغیانِ محبت ہے۔ وفورِ ہمدردی سے آنکھیں نم ہیں۔ چہرے پر چمک ہے۔ لبوں پر مشفقانہ تبسم ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عمارت پھیلنے لگتی ہے۔ پھیلتی جاتی ہے حتیٰ کہ تمام کائنات کا احاطہ کر لیتی ہے۔

پھر چند دن بعد، جب وہ حرم سے وداع ہونے والا ہے، اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اب خانہ کعبہ خالی ہے، اُس کی نظر ایک افریقی قافلہ پر پڑتی ہے جو عجز و عقیدت سے پچھلے قدموں چلتے ہوئے حرم سے وداع ہو رہا ہے۔ وہ اس نظارے سے مبہوت رہ جاتا ہے۔ قافلہ غمِ وداع سے نڈھال ہے۔ یہ انتہائی متاثر کن منظر ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ شاید اللہ میاں افریقیوں کے ہمراہ جا رہا ہے۔ واقعی اُن کے ساتھ جا رہا ہے۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور اب مفتی کی نظر میں کعبہ پتھر کا خالی گھر رہ جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس قافلہ کو ڈھونڈے۔ اس کے ساتھ ہو لے تاکہ کچھ لمحوں کے لیے تو وہ بھی خدا میں سما جائے اور یوں خدا ہو جائے۔ وہ دروازے کی طرف بھاگتا ہے لیکن قافلہ جا چکا ہے اور مفتی مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر جب وہ آنکھیں اٹھاتا ہے تو اُسے خدا نظر آتا ہے۔ بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھا۔ لباس تار تار، چہرے پر فکر و تشویش وداع ہونے والے ہر حاجی کی طرف اُنگلی بڑھاتا ہے۔ اُس کا دامن پکڑتا ہے۔ کہتا ہے مجھے ساتھ لے چلو۔ مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ مجھے اُنگلی لگا کر ساتھ لے چلو۔ اب یہ گھر خالی ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ اس انتظار میں کہ مجھے تم ساتھ لے چلو۔ لیکن کوئی اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مفتی بھی اُس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ کہتا ہے ''میں اپنی انا سے بھرا ہوا ہوں۔ میں نے اپنی انا کو بت بنا لیا ہے۔''

مفتی دقیانوسی انداز میں خدا کی بات نہیں کرتا۔ نہ اس نے اپنی غیر معمولی کامیابیوں، پارسائی اور ماہیتِ قلب کی باتیں کی ہیں جو چند مثالیں میں نے پیش کی ہیں وہ بھی تضادات

اور بوالعجبیوں سے عبارت ہیں جن سے پوری کتاب بھری پڑی ہے۔ وہ ایک متشکک ہے جو ایک نجومی کی بات پر ڈول جاتا ہے۔ ایک ایسا زائر جو زائرین کی پرواز کو جہاز کے اغوا کا واہمہ سمجھتا ہے، ایک غیر مذہبی فرد ہے جس کو قریب قریب خدا کا دیدار حاصل ہوتا ہے۔ ایسا سفر نامہ لکھنا جس کا مقصد احتساب کے بغیر اپنے متضاد تجربات واحساسات پیش کرنا ہو مغرب زدہ عالمی تجربے میں شامل ہونے کے مترادف ہے، جو جدید ادب کی ایک صنف ہے۔ اس کے ساتھ ہی مکہ معظمہ جانا مسلمان ہونے کا برملا اعلان بھی ہے۔

مفتی کی مسلمانی اسلام کے ایک مخصوص طبقے کی خصوصیات رکھتی ہے۔ یہ ایک علاقائی اسلام ہے جو قیامِ پاکستان کے نصف صدی بعد بھی ہندوؤں سے مشترک عناصر کا حامل ہے۔ اسلام کی یہ علاقائی صورت صوفیا کی باطن پرستی اور ملائیت سے گریز پر مبنی ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس کتاب میں نمایاں ہیں۔ خدا کو صنم بنانا جو ہندوانہ تصور ہے، اُسے کرشن نما ''طفلِ خدا'' کی صورت دینا جو حرم کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھا ہے، اسلامی تصورات و استعارات کو چونکا دینے والی لیکن مانوس صورت دینے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔

مفتی کا الفاظ کا استعمال، اپنا گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ اس کا دوغلا پن دوسروں سے مختلف نہیں لیکن سیاست نے اردو کے ہندی (ہندوانہ) اور عربی فارسی (اسلامی) عناصر کو واضح طور پر نمایاں کر دیا ہے۔ اُس کی ہندوانہ لغت کا زیادہ استعمال اُسے مذہبی اور ادبی مشاہیر سے منفرد کرتا ہے۔ مغرب کے دانشوروں کی طرح وہ معتبر لگنے کی خاطر عام لوگوں سے مماثلت پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ مکّہ میں حرمِ کعبہ کو وہ ''کوٹھا'' کہنے پر مُصر ہے، جو گھریا کٹیا کے لیے پنجابی لفظ ہے۔ (جبکہ پنجابی کسان اس سلسلے میں عربی الفاظ استعمال کرنے کی تگ ودو میں لگے ہیں) ایک ہم سفر حاجی اُسے اس توہین پر متنبہ کرتا ہے۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے مفتی اعلان کرتا ہے کہ وہ اہلِ زبان اردو دان نہیں بلکہ پنجابی ہے اور لفظ ''کوٹھے'' کا استعمال خانہء کعبہ کو مانوس اور عزیز بنا دیتا ہے۔

علاوہ ازیں مفتی انگریزی الفاظ بھی بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ انگریزی پڑھے ہوئے مغرب سے متاثر لوگوں کی دنیا مفتی کی بھی دنیا ہے۔ وہ

سائنس، اشیائے صرف، صفائی کے جنون اور جنس کے لیے انگریزی الفاظ استعمال کرتا ہے، جو صرف خارجی ماحول بیان کرتے ہیں تو ایک صاحب ناپنے کا فیتہ لیے حرم میں داخل ہوتے ہیں اور انگریزی میں کہتے ہیں "I beg your pardon" اپنے رفیق حاجی اور گائیڈ قدرت اللہ شہاب کے نفسیاتی اور مذہبی عقائد کے بیان میں بھی وہ انگریزی الفاظ و اصطلاحات کا سہارا لیتا ہے۔ وہ ''نفسیاتی مزاحمت'' (Psychological resistance) ''مراجعت کے مسائل'' (Problem of reversion) ''مقدس بے نیازی'' (Devine Unconcern) اور عبادت میں ''خود شناسی'' (Identification) کے تصورات کے اظہار کے لیے انگریزی اصطلاحات ہی استعمال کرتا ہے۔

اس تمام عمل میں ہندوستانی روایت کی گونج مسلسل سنائی دیتی ہے۔ اول تو یہی کہ طلسماتی کیفیت عام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت صرف مادی اشیاء کے مشاہدے تک ہی محدود نہیں اور نہ یہ کلیتاً انسان کے اختیار میں ہے۔ خواب اور تصورات عام زندگی کا جزو ہیں۔ ان پر صرف ماضی کے عظیم بزرگوں کی ہی اجارہ داری نہیں، بلکہ پاکستان کے مغربی تعلیم یافتہ بیوروکریٹس اور کافی ہاؤس دانشوروں کی روزمرہ کی زندگی کا تجربہ ہیں۔ ان سے خود کو علیحدہ کرنے کی مفتی کی کوشش ان واقعات کو زیادہ طاقتور بنا دیتی ہے۔ وہ اپنا ایک انتہائی اہم خواب بیان کرتا ہے لیکن جھٹ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اس خواب میں اس کی دلچسپی کسی مقدس ایقان کا نتیجہ نہیں بلکہ لاشعور کے بارے میں اُس کی تلاش اس کا ماخذ ہے۔ اسی طرح وہ ہمیں اُس ''ایڈووکیٹ'' کے بارے میں بتاتا ہے جس کے وسیلے سے قدرت اللہ شہاب صاحبِ اولاد ہوئے، جبکہ طبی سائنس مایوس ہو چکی تھی تاہم وہ اسے اتفاق قرار دیتا ہے۔ ہر دو واقعات میں معقول سائنسی بیان جو انہونی کو ہونی کی شکل دیتا ہے طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور مقصد غیر واضح رہتا ہے۔

کعبہ کے بت کے مرکزی تصور میں کسی تحفظات کا اظہار نہیں کیا گیا نہ استفسارات کیے گئے ہیں لیکن مصنف نے یہی انداز اختیار کیا ہے جیسے کہ ہر شدید جذباتی اظہار کے بعد وہ واقعاتِ حج کا سپاٹ، غیر ذاتی، نثری اظہار کرتے ہیں، گویا اپنا مذاق اڑا رہا ہو۔

''حاجیوں کو میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ سفرِ حج پر جاتے ہوئے اچھی سی قینچی ساتھ لے جائیں۔'' وہ کامیابی سے یہ دہرا رویہ اختیار کرتا ہے۔

مفتی ہر عمل کے محرکات کو داخلی کی بجائے خارجی قرار دیتا ہے۔ معلوم نہیں یہ صرف اندازِ خطابت ہے یا حقیقت البتہ تقدیر پرستی کی اس روایت سے اس متشکک کو جواز مل جاتا ہے۔ اس کے حج پر جانے میں بھی ایک دوسرے فرد قدرت اللہ شہاب کا عمل دخل ہے، جو اس کتاب کا دوسرا اہم کردار ہے۔ قدرت کو وسیلہ اور شیخ بنا کر بھی مفتی نے برصغیر اور اسلام کی ایک دیرینہ اور بھرپور روایت کا سہارا لیا ہے۔ یہ روایت پیر اور مرید کی روایت ہے، جو انفرادی زندگیوں کو بدل دیتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جنوبی ایشیا کے رہنے والوں کے لیے یہ روایت اُسی قسم کی مرکزیت کی حامل ہے، جو بارہویں صدی کے بعد یورپ میں رومانوی محبت کو حاصل تھی۔ یہاں بالکل یہی صورتِ حال ہے، مفتی صاف کہتا ہے کہ شہاب کے بغیر وہ یہ سفر کبھی نہ کرتا لیکن شہاب شیخ کے کردار کے لیے موزوں نہیں۔ وہ صدرِ پاکستان کے مشیر کی حیثیت سے روحانی رہنما کے روایتی کردار میں جچتا نہیں۔ وہ خود اوہام کا شکار ہے۔ وہ یقین اور شک کے درمیان معلق ہے۔ پھر بھی اس سفرنامے میں وہ ایک کلاسیکی شیخ کا انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔ کشف کے ذریعے اُسے مفتی کی کیفیت کا علم ہوتا ہے۔ اُسے ایسی تلاش پر بھیجتا ہے جس کا مقصد مبہم ہے، وہ دقیق سوالوں کے مبہم جواب دیتا ہے۔ وہ عاجزی اور کسرِ نفسی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی ہے اور اس سے ماورا بھی۔ وہ ہر شخص میں خیر تلاش کرتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی کردار کشی اور دوسرے معاملات میں مفتی نے اپنی ثقافت میں مشائخ کے حالات و تجربات کی تذکرہ نویسی کی مرکزی روایت سے اپنے بیان کو سجایا سنوارا ہے۔

اپنے روحانی تجربات کے لمحات کی شدت کے باوجود مفتی کو اپنی محدودیت پر اصرار ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ خصوصی تقدس کے مقامات پر وہ عبادت سے قاصر رہا۔ حرمِ کعبہ سے وہ اس لیے اضطراری کیفیت میں نکل گیا اُسے یوں محسوس ہوا کہ ایک اندرونی شور سے اُس کا سر چکرا رہا ہے اور اُس سے ناخوشگوار بو آ رہی ہے۔ حرمِ نبوی میں

اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے نزول الہام کا مقام ایک اکھاڑا ہے جہاں لوگوں کو پچھاڑا جارہا ہے اور وہ کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ دوسرے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے کہ وہ ذہنی پراگندگی میں مبتلا ہیں لیکن خود بھی اسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اُسے اصرار ہے کہ اُس کی ماہیتِ قلب نہیں ہوسکتی۔ کتاب کے آخری باب میں عنوانات سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے مثلاً ''جیسے گئے ویسے لوٹے'' اور ''وہی ممتاز مفتی'' وغیرہ۔

مفتی خود کو گماں و یقیں کی کشمکش میں گرفتار پاتا ہے۔ مکہ معظّمہ میں خود کو ایک پُرآسائش ہوٹل میں پا کر وہ تصور کرتا ہے کہ یہاں برطانوی راج کی باقیات کا بسیرا ہے۔ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ اُس کی دو محبوبائیں ہیں۔ ایک تو کعبہ کی باپردہ عفت مآب بیگم اور دوسری ہوٹل کی میم جو اُس کی آغوش میں بیٹھی انگریزی میں کہتی ہے ''ڈارلنگ، اتنے توہم پرست نہ بنو۔'' جب جمرات پر کنکریاں مارنے کا وقت آتا ہے (یہ جمرات اُن شیاطین کی علامت ہے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھٹکانے کی ناکام کوشش کی تھی) تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن پر کنکریاں مارنے کی بجائے وہ مفتی کو سنگسار کر رہے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا وہ مجھے بھٹکانے والا سمجھتے ہیں؟ کیا بھٹکانے والا خود اس کے اندر ہے؟ وہ پکار کر کہنے کی کوشش کرتا ہے کہ لوگو! کنکریاں مجھے مارو۔ دوسری طرف وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ وہ سوداگروں کی طرح نیکیاں کمانے نہیں آیا۔ وہ اپنے ساتھی حاجیوں کو دیکھتا ہے جو اُس کے خیال میں حج کو جنت کے لیے ایک بکنگ آفس سمجھتے ہیں یا پھر گناہوں کو دھونے کے لیے ڈرائی کلیننگ فیکٹری۔ یوں وہ چند رسومات ادا نہ کرنے کے لیے جواز تلاش کرتا ہے۔

مفتی اپنے فلسفہ نسبیت (کہ حق انصافی ہے اور زماں و مکاں اور انفرادی تجربات پر منحصر ہے) کے بارے میں سوال ضرور اٹھاتا ہے لیکن اس سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ وہ اسے مغربی سائنسی اثرات کا نتیجہ سمجھتا ہے لیکن صرف یہی نہیں، اس کے تجربات کا اندازِ اظہار ہی اُسے اُس تشکیک کی روایت سے منسلک کرتا ہے، جو صوفیا روایتی مذہب اور باطنی تجربات

کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہ روایت عام آدمیوں اور دیہاتیوں کی ثقافت میں رچی بسی ہے اور آخر میں اس پس منظر میں اُس کے نہ بدلنے کا دعویٰ ایک طنزیہ پیرایہء اظہار ہے۔

ممتاز مفتی کا بیان اُس جیسے بے شمار لوگوں کے جذبات اور ذہنی طور پر متضاد تصورات کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ روایتی مذہب سے دور ہے اور اس کے محرکات کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی آزادی کا شیدائی ہے، حالانکہ وہ مغرب کا مقلد ہونے پر اپنا مذاق بھی اڑاتا ہے۔ وہ اس نظریے کا سختی سے پیروکار ہے اور کچھ نہیں تو پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "ایک عظیم انسان" سمجھتا ہے۔

مغرب زدہ مسلمانوں نے بھی نسل در نسل اسی عقیدے میں پناہ لی ہے لیکن مفتی اس سے زیادہ کا طالب ہے۔ اس لیے وہ اپنے سیکولر دوستوں کو حیران کرنے کے لیے سفرِ حج پر جاتا ہے اور جاتے ہوئے مُڑ مُڑ کر خود کو اُن کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ دیارِ مقدس میں پہنچ کر وہ اس بے پایاں ہجوم کا حصہ بننے سے نروس ہو کر گریز کرتا ہے، اسے ہر جگہ تضادات، بے آہنگی اور مخلوط جذبات ملتے ہیں، خصوصاً اپنے اندر تاہم اُسے مکہ میں ایک قسم کا اللہ اور مدینہ میں پیغمبر اسلام کی کچھ تجسیم بھی ملتی ہے۔ وہ انہیں چھوڑ آنے کا فیصلہ کرتا ہے لیکن واپسی پر اُسے یہ علم بھی ہے کہ جہاں سے وہ آیا ہے وہاں کوئی مشفق قوت ہے، جس کا غیر متوقع طور پر اور مختلف انداز میں ظہور ہوتا ہے۔

یہ اُن کا اسلام نہیں جو خواہ وہ بنیاد پرست ہوں یا مغربی دانشور جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی جامد شے ہے۔ نہ یہ اُن روحانی بازوں کی دلیرانہ تلاش ہے جو ایک وحدت کی جستجو میں ہیں جو دنیاوی میلان سے ماورا ہے۔ مفتی شعوری طور پر اُن کے قریب ہے لیکن اُن کی کمٹ منٹ سے دور ہے۔ تاہم یہ داستان لکھ کر اُس نے ایک دعویٰ کیا ہے کہ مکہ اُس جیسے لوگوں کا بھی ہے جن کا ایمان ناقص ہے اور وقتی ہو سکتا ہے لیکن جن کے جو بھی عقائد ہیں وہ اُن کے اپنے ہیں۔

-☆-

بیسویں صدی کا نمائندہ ادیب: ممتاز مفتی

ہر اہم تمدنی دور کے آخری حصے میں اس پورے دور کا ایک ادبی مفسر ہوتا ہے۔ جس کی ادبی تخلیقات اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں مثلاً جرمن شاعر گوئٹے اپنے عہد کے جرمن کلچر کا نمائندہ تھا۔ اس کے کلام میں جرمن کلچر کے سارے دھارے تھے۔ انگلستان کے وکٹورین عہد کے نمائندہ شاعر شیکسپیئر کی شاعری میں اس دور کے انگریزی کلچر اور تہذیب کی مکمل نمائندگی ہے۔ غالب ہندوستان میں آخری مغلیہ دور کے تمدن کا عکاس ہے۔ اقبال انیسویں صدی کے برصغیر ہندو پاک کی تہذیب و تمدن اور فکر کا نمائندہ شاعر ہے اور برصغیر میں اسلامی نشاۃ الثانیہ اور بیداری کا نقیب ہے۔ ممتاز مفتی نثری ادب میں بیسویں صدی کے پاکستانی تمدن کا مظہر ہے۔ مفتی بیسویں صدی کے آخری نصف میں پاکستانی کلچر کا نقیب رہا۔

"نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں"

ممتاز مفتی بیسویں صدی شروع ہونے کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے اور اس صدی کے ختم ہونے سے پانچ سال پہلے وفات پا گئے۔ مجموعی طور پر ممتاز مفتی پاکستان کے بیسوین صدی کی نثری ادب کی شناخت ہے۔ سوائے تنقید کے جسے مفتی ادب میں شمار نہیں کرتا بلکہ غیر تخلیقی لکھاریوں کا اپنی اہمیت جتانے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

ممتاز مفتی ایک کثیر الجہت ادیب ہے۔ اُس کے نزدیک اصل اہمیت ابلاغ کی ہے ابلاغ کے مختلف سانچوں کی بنیادی اہمیت نہیں۔ اس نے نثری ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسانے لکھے، ناول لکھے، ڈرامے لکھے، سفرنامے لکھے، رپورتاژ لکھے،

شخصیات لکھیں، خودنوشت سوانح حیات لکھی اور وہ کچھ بھی لکھا جس کا ادبی صنف بندی میں کوئی نام نہیں جس کی واضح مثال اس کی آخری کتاب ''تلاش'' ہے، آپ اسے انشائیہ بھی نہیں کہہ سکتے Essay بھی نہیں کہہ سکتے صرف تحریر میں Loud thinking کہہ سکتے ہیں لیکن صاحبو! کیا تحریر ہے خود کہا کرتا تھا۔ یہ مجھ سے لکھوایا جا رہا ہے۔

ممتاز مفتی نے سال ہا سال ریڈیو کے لیے لکھا۔ کس کامیابی اور اثر انگیزی سے لکھا لیکن ممتاز مفتی کی ریڈیائی تحریروں کی صوتی ابلاغ میں کتنی اہمیت تھی۔ اس کا ذکر بعد میں ہو گا۔ اشفاق احمد عرف ''تلقین شاہ'' جس نے پہلے ریڈیو اور پھر ٹیلی ویژن کے لیے خود کو وقف کیے رکھا ابلاغ کے ان ذرائع کے بارے میں ممتاز مفتی کے رویے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''ممتاز مفتی نے کئی برس چلا چلا کر کبھی محبت سے، کبھی چالاکی سے، کبھی دوستی کا واسطہ دے کر واضح الفاظ میں کہا کہ یہ شوبزنس کا ڈھنڈورا اچھوتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو اور اپنا ٹیلنٹ ضائع نہ کر، لکھو، لکھو اور ادب کے ذیل میں لکھو۔ لٹریچر سے وابستہ رہ کر لکھو۔ یہ رونمایاں، تلقین شاہیاں، سب چھلنی کا پانی ہیں۔ جب بہہ گیا اور ڈھل گیا تو ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔'' (اماں وڈھی)

ممتاز مفتی لکھے حرف کو بہت اہمیت دیتے تھے کہا کرتے تھے کہ کیا خالقِ کائنات کو الیکٹرانک میڈیا کا (نعوذ باللہ) علم نہیں تھا؟ پھر بھی ارشادِ باری تعالیٰ یہی ہے۔

> ''آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم عطا کیا اور ان چیزوں کا علم انسان کو دیا جن کو وہ نہ جانتا تھا۔ (سورۃ العلق)

قیامِ پاکستان کے شروع کے دنوں میں ممتاز مفتی نے ایک بزم کی ابتدا کی جس کا نام انہوں نے ''لکھ یار'' رکھا۔ اس کا مقصد ان اصحاب کو لکھنے اور لکھتے رہنے پر مائل کرنا تھا جن میں لکھنے کی صلاحیت تھی اور جو بوجہ ان دنوں لکھنے سے گریزاں تھے۔ ان میں مختار صدیقی، ابن الحسن، محمد عمر مہاجر، مسعود قریشی، عطا حسن کلیم اور محمد عمر شامل تھے۔ ان سب پر مفتی نے

ایک شرط عائد کر دی تھی کہ جب بھی آپس میں مل بیٹھنے کی سبیل ہو تو ہر شخص اپنی نئی تصنیف پیش کرے گا۔ چاہے کوئی نثر پارہ، کوئی غزل یا نظم ہو۔ مفتی جس کسی میں ادبی تخلیقی اہلیت دیکھتا اسے لکھنے پر اکساتا۔ ہمت افزائی کرتا، رہنمائی کرتا، چھپنے میں مدد دیتا۔ دنیائے ادب میں آج کئی معتبر نام ہیں جنھوں نے مفتی کی تحریک پر لکھنا شروع کیا پھر لکھنا جاری رکھا۔

نثری ادب کی کوئی بھی صنف ہو ممتاز مفتی نہ گریمر کا غلام ہے، نہ محاورے کا، نہ روزمرہ کا، نہ لغت کا۔ الفاظ اس کے لیے ابلاغ اور اظہار کا وسیلہ ہیں ان کا بالذات کوئی تقدس نہیں۔ وہ مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لیے الفاظ اور تراکیب کو توڑنے مروڑنے سے نہیں جھجکتا۔ اس عمل میں روزمرہ یا محاورے کی صورت بگڑ جائے تو اسے کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ لفظ ٹکسالی اردو کا نہ ہو تو وہ اسے کھوٹا سکہ نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی ٹکسال لگا رکھی ہے جو اب قبولِ عام کا مرتبہ حاصل کر کے خود سکہ رائج الوقت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ بیان کے سلسلے میں ممتاز مفتی کو الفاظ کی صوتی اہمیت کا شدید احساس ہے۔ جس طرح اردو ادب میں حفیظ جالندھری شعر میں صوتی تاثر کا سب سے بڑا شاعر ہے (وہ کہا کرتا تھا ''خاموش'' اور ''چپ'' ایک ہی معنی کے دو مختلف الفاظ نہیں بلکہ دونوں کا ابلاغ مختلف ہے) اسی طرح ممتاز مفتی نثر میں صوتی تاثر کا منفرد ادیب ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی۔ جب اس کے مجموعے ''روغنی پتلے'' کی تقریب رونمائی ہوئی تو اس محفل میں قدرت اللہ شہاب نے چند ڈانٹ ڈپٹ والی باتیں سرِ محفل کہہ دیں۔ انہوں نے کہا ''روغنی پتلے'' کی رونمائی کی اس تقریب میں حصہ لینے کی جرأت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ مجھے یقین ہے کہ اگر ممتاز مفتی کے منہ پر سچی بات کہہ دی جائے تو وہ برا نہیں مانتے تن کی دنیا کے پیچ و خم کی دنیا کی بھول بھلیاں اور تحت الشعور کی نیم تاریک غلام گردشیں ممتاز مفتی کے فن کے محبوب موضوعات ہیں۔ وہ اپنی حد تک ان موضوعات کے ساتھ پورا انصاف کر چکے ہیں۔ اب ان کے تخلیقی جوہر کے لیے یہ موضوعات بند پانی کا جوہڑ ہیں جن پر کائی کے سوا اور کچھ نہیں جمتا۔ روغنی پتلے کے صنم خانہ آذری میں ادب کے ٹین ایجر Teenager کے لیے بہت بڑا سرمایۂ نشاط، جنتِ نگاہ اور

فردوس فخر وانبساط ہے لیکن ممتاز مفتی جیسے عظیم اور منجھے ہوئے تخلیق کار کو تو اب تک آتشِ نمرود کی بھٹی سے گزر جانا چاہیے تھا۔

اب ممتاز مفتی کے ناولوں کی کچھ باتیں ہو جائیں۔ ممتاز مفتی کا پہلا ناول ''علی پور کا ایلی'' ہے یہ قیام پاکستان تک ممتاز مفتی کی آپ بیتی ہے۔ سفاک سچائیوں سے بھرپور۔ اس میں ممتاز مفتی نے اپنی زندگی کے واقعات پر ''وقار'' اور ''عزت'' کے دلکش پردے ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ رندانہ جرأت سے اپنے سب داغ دھبے دکھا دیئے ہیں بلکہ بعض مقامات پر تو انہیں اس طور پر نمایاں کیا ہے جیسے وہ ملامتیہ فرقے کا رکن ہو۔ ناول کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

> ''اپنی دانست میں مَیں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اسی مقصد کے لیے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔۔۔ بہر حال اردو ادب میں شاید کوئی کہانی نہیں ملے گی جس کی تفصیلات براہ راست اصل زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چناؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔'' (دیباچہ دوسرا ایڈیشن)

ممتاز مفتی کا دوسرا ناول ''الکھ نگری'' ۹۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ضمیمہ اور خطوط کو بھی شامل کر لیا جائے تو تقریباً ہزار صفحے پورے ہو جاتے ہیں۔ کتاب کے سرورق پر نام ممتاز مفتی کا ہے لیکن تصویر قدرت اللہ شہاب کی۔ یہ اظہارِ عقیدت ''من تو شدم تو من شدی'' کی تفسیر پیش کرتا ہے۔

مجموعی طور پر الکھ نگری بہت منفرد اور بہت دلچسپ ہے۔ اس میں مفتی نے ایک جدت تو یہ کی ہے کہ مختلف کردار پیش منظر میں رہتے ہیں اور خود مفتی پس منظر میں رہتے ہوئے ان کو تسلسل کا رشتہ مہیا کرتا ہے۔ دوسرے کرداروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے منظر اُبھرتے ہیں اور تکمیل مفتی کے نقش کی ہوتی ہے۔ الکھ نگری میں ممتاز مفتی نے الف لیلوی

تکنیک اپنائی ہے۔ ایک کہانی سے دوسری کہانی اور ایک کردار سے دوسرے کردار کا ذکر چل پڑتا ہے۔ کہانیاں اپنے اپنے انفرادی انجام کو پہنچتی رہتی ہیں اور ممتاز مفتی کی مجموعی زندگی کے نقش بنتے چلے جاتے ہیں۔ الکھ نگری میں تقسیم برصغیر کی حقیقت پسندانہ عکاسی سفاک سچائی سے کی گئی ہے۔ مہاجر کیمپوں کے حالات اور متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹ کے بیان میں بیشتر مہاجرین کو اپنے تلخ تجربات کی جھلک نظر آئے گی۔ اس حق گوئی میں ممتاز مفتی نے خود کو بھی نہیں بخشا۔ اس وحشیانہ ماحول میں جن کرداروں نے انسانیت کی لاج رکھ لی اُن میں مفتی نے کوئی مذہبی تعصب اور علاقائی امتیاز نہیں برتا۔ ان میں ایمن آباد کی شیخیاں ہیں جو انسان دوستی کی علامت ہیں۔ ریل گاڑی میں مسلمان کو پناہ دینے والی سکھنی ''پرناموں'' ہے۔ ریفیوجی کیمپ کی بے باک حسینہ ''ناجو'' ہے، بے خوف عاشق ہیرا ہے۔

ممتاز مفتی کی تحریر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اندازِ بیان دلچسپ اور پُرکشش ہوتا ہے۔ قاری اس کے نظریے سے اتفاق کرے یا نہ کرے لیکن اس پیرایۂ بیان سے لطف اندوز ضرور ہوتا ہے۔ اس کے جملوں میں ڈرامائی کیفیت، انوکھا پن، شائستگی اور بصری امیج ہوتے ہیں اس کے کردار عمومی روش سے ہٹ کر عجب اور ندرت کا عنصر لیے ہوتے ہیں۔ اس کا شگفتہ اندازِ بیان اور انفرادی نقطۂ نظر اس کی تحریر کو اتنا دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ پڑھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت ''الکھ نگری'' میں عروج پر ہے۔ الکھ نگری مختلف انسانی جذبات اور تصورات پر مفتی کے ذاتی تبصروں سے بھری پڑی ہے۔ ان میں فلسفیانہ سنجیدگی یا خطیبانہ طوالت نہیں ہوتی بلکہ ''چلتے چلتے'' کا اختصار اور چٹخارے کی چاٹ ہوتی ہے۔

ممتاز مفتی نے سفرنامے بھی لکھے۔ اس نے سفرناموں کا آغاز غیر ملکی سفر کی داستانوں سے نہیں کیا۔ اس نے پہلا سفرنامہ ۱۹۵۳ء میں وادیٔ کاغان کے سفر کے بارے میں لکھا۔ اس وقت کاغان کا سفر جان جوکھوں کا سفر ہوتا تھا۔ بالاکوٹ سے آگے صرف جیپ جاتی تھی۔ چلتے وقت ڈرائیور کہتے ''صاحبو توبہ استغفار کرلو اس سفر میں ڈرائیور کی مہارت نہیں صرف اللہ کا فضل سلامتی کا ضامن ہے۔'' ممتاز مفتی کے دوسرے سفرنامے کا عنوان تھا ''چھڈ یار'' یہ سفر گلگت، ہنزہ اور نگر کے سلسلے میں تھا اس سفر میں ہمارے ساتھ لوک ورثے کا

رسیا عکسی بھی شامل تھا۔ عکسی نہ صرف لوک فن کے مقامی نمونے جمع کرتا بلکہ لوک داستانوں اور روایات کے کھوج میں بھی لگا رہتا بڑے بوڑھوں سے مقامی روایات، رسم و رواج اور رہن سہن کے طور طریقے پوچھتا۔ ممتاز مفتی کو بھی اس سفر میں ماضی کی عمیق گہرائیوں میں اور تاریخ کے دھندلکوں میں جھانکنے کا چسکا پڑ گیا۔ یوں شمالی علاقہ جات کا یہ سفرنامہ بہت بڑے کینوس پر پھیل گیا۔ مقامی باشندے، گزرے ہیرو اور زندہ مقامی لوگ اور ان کی روایات۔ سینہ بہ سینہ چلتے رومان بھی اس سفر میں زندہ ہو گئے جو کئی قسطوں میں چھپا۔

کتابی صورت میں چھپنے والا مفتی کا پہلا سفرنامہ ''ہند یاترا'' ہے اور دوسرا ''لبیک''۔ ''لبیک'' سفرناموں کا نقطۂ عروج ہے۔ جیسے کوئی مسلمان حج پر از خود نہیں جا سکتا جب تک بلاوا نہ ہو اسی طرح لبیک جیسا سفرنامہ نہیں لکھا جا سکتا جب تک تائیدِ ایزدی اور رسالت کی نگاہِ کرم شاملِ حال نہ ہو۔ لبیک نے جو مقبولیت حاصل کی وہ بھی خداداد بات ہے۔ کئی ایڈیشن چھپے اور جلد ہی مفتی کو احساس ہوا کہ یہ تحریر اس کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اس سے لکھوائی گئی ہے، ایک امانت ہے، چنانچہ مفتی نے لبیک کو کاپی رائٹ کی پابندیوں سے آزاد کر دیا کہ جس کا جی چاہے چھاپے۔ جیسی چاہے، جتنی چاہے چھاپے۔ اس مبارک سفر کی بشارت ممتاز مفتی کو راولپنڈی شہر کے چوک فوارہ کے قریب ایک ملنگ سے ملی۔ اس کا ذکر مفتی سے سنیے۔

> ''ایک شام میں فوارہ چوک سے گزر رہا تھا بجلی فیل ہو جانے سے چوک میں اندھیرا تھا میں ہجوم سے بچ کر سڑک کے ایک طرف چل رہا تھا کہ دفعتاً ایک سیاہ فام جسم میرے سامنے اُبھرا۔ بال بکھرے ہوئے آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا پھر خوشی سے چلّا کر بولا ''تو حج پر جائے گا تو حج پر جائے گا۔ تو نے۔۔۔''

''آخر مفتی مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ خانۂ خدا کے عنوان سے اس کا ذکر مفتی کی زبان سے سنیے۔

"دفعتاً خانہ خدا میرے سامنے آ گیا۔ کالے پتھروں سے بنا ہوا ایک چوکور کمرہ۔ جس پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ بیشتر اس کے کہ میں "اللہ اکبر" کہہ پاتا چھت سے کسی نے سر نکالا۔ چہرے کی جھریوں میں محبت کا ایک طوفان ابھر سمٹ رہا تھا۔۔۔ میرے قلب میں ایک دھماکہ ہوا۔ میرے وجود کی دھجیاں اڑ گئیں۔ وہ عظیم الشان مسجد معدوم ہو گئی۔ پھر حرم کعبہ اُبھرا، اُبھرتا گیا حتیٰ کہ ساری کائنات اس کی اوٹ میں آ گئی۔"

اور پھر حرمِ کعبہ سے حج کے بعد روانگی کا ذکر تو تاثیر میں ڈوبی تحریر اور اشاراتی ندرتِ بیان کا شاہکار ہے۔ ذرا مختصر سا اقتباس سنیے۔

"جب کوئی وداع ہونے والا حاجی حرم کے بیرونی دروازے سے باہر نکلتا تو وہ محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا اور اپنی انگلی آگے بڑھا کر کہتا مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مجھے ساتھ لے چلو۔ نہیں نہیں حرم کی جدائی کا غم نہ کھاؤ۔ وہ تو خالی ہے میں تو یہاں بیٹھا تمہارا راستہ دیکھ رہا ہوں۔ تمہارا منتظر ہوں۔ تمہارے ساتھ جانے کا خواہاں ہوں۔ لیکن سب مکان میں کھوئے ہوئے تھے اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ مکین کو بھول چکے تھے۔"

آخر میں ممتاز مفتی سے مدینہ منورہ کا ذکر سنیے:

"مدینہ منورہ کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ کسی نے نہیں دیکھا کسی نے نہیں جانا۔ یہاں جو بھی آتا ہے اس کی توجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لگی ہوتی ہے سب کی نگاہیں حضورؐ کی طرف اٹھتی ہیں سب کے دل حضورؐ کے لیے دھڑکتے ہیں۔ سب کے دلوں کا فوکس حضورؐ پر مرکوز ہے۔ باقی سب کچھ دھندلا ہے۔ آؤٹ آف فوکس ہے حضورؐ ایک عظیم مینار ہیں اور شہر اس مینار کا سایہ ہے۔ صرف یہ ایک

شہر ہے جہاں سچا دین عملی طور پر رائج ہے یہاں دین کے متوالے ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے ہیں اس شہر میں کوئی گنہگار نہیں معصیت کا احساس اس شہر میں خوش قسمتی کا نشان ہے کیونکہ معصیت کا احساس نہ ہو تو رحمت کیسے جوش میں آئے۔

مدینہ منورہ میری نگاہوں میں سمٹتا جا رہا تھا۔ سمٹتا جا رہا تھا اور وہ عظیم گنبد اُبھرتا آ رہا تھا اُبھرتا آ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عظیم گنبد ساری کائنات کا احاطہ کر لے گا اور اس کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ اشہد انا محمد الرسول اللہ مسجد نبوی سے عصر کی اذان گونجی۔"

ممتاز مفتی کا پہلا سفر نامہ ہند یاترا ہے یہ سفر مفتی نے حضرت نظام الدین اولیاء کے عرس میں شامل ہونے والے ایک پاکستانی زائر کی حیثیت سے کیا لیکن دلی کو ایک مسلمان ادیب کی نظر سے دیکھا۔ اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے ممتاز مفتی نے لکھا کہ ہند سرکار نے دہلی کو اپنا پایہء تخت بنا کر غلطی کی ہے۔ اس شہر پر تو مسلمانوں کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ صدیوں مٹائے نہ مٹے۔ یہاں ہندو اکثریت کی ثقافت تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شرمندہ شرمندہ سی سرنگوں سی رہے گی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت بختیار کاکیؒ کے مزارات، جہاں کی فضائیں اسلامی تصوف سے رچی ہوئی ہیں قطب صاحب کی لاٹھ اور مسجدِ قوت الاسلام، اسلامی عظمت وشوکت کا ہمہ وقت اعلان کر رہی ہیں اور پرانی دلی کے عین وسط میں بلند سیڑھیوں پر براجمان شاہی مسجد اور اس کے سامنے لال قلعہ، ان سے سیاح تو کیا وہاں کے رہنے والوں کی نظریں تو ہٹ ہی نہیں سکتیں دل اسلامی تہذیب کے ان لازوال نقوش سے غافل ہو ہی نہیں سکتے۔

اب آیئے ممتاز مفتی کی آخری کتاب "تلاش" کا جائزہ لیں۔ یہ کتاب کسی ادبی سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتی دیباچے میں مفتی خود کہتا ہے کہ یہ کتاب نہ فلسفہ بگھارتی ہے، نہ علمیت چھانٹتی ہے۔ نہ دانشوریاں پیش کرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب ہی نہیں میں نے بڑی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب نہ بن جائے Bookish نہ ہو جائے۔ بوجھل نہ ہو

جائے۔ایسی اونچی باتیں نہ کرے جو سر کے اوپر سے گزر جائیں۔''

یہ کتاب ''تلاش'' ممتاز مفتی کی نوے سال کی زندگی کے مشاہدات، تجربات مطالعہ اور سوچ کا پھل ہے۔کمال کی بات ہے کہ ممتاز مفتی جیسے دینی علوم سے بے بہرہ فرد نے دین اسلام کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔اس کتاب کے لکھے جانے کے مختلف مراحل کا میں عینی شاید ہوں۔ مفتی کہا کرتا تھا کہ یہ کتاب میں نہیں لکھ رہا یہ مجھ سے لکھوائی جا رہی ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے موثر ابلاغ کا عطیہ دیا ہے اب دینے والا اس عطا کا اجر مانگتا ہے۔

''تلاش'' لکھنے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ممتاز مفتی لکھتا ہے:

> ''میرے ایک دوست ہیں محمد طفیل۔قرآن کریم کے پروانے، زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ قرآن پر مرکوز رہے ایک دن میرے گھر آئے اور قرآن مجید کے چند قیمتی نسخے چھوڑ گئے۔اس کے بعد جب پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ قرآن مجید کے اتنے قیمتی نسخے مجھے کیوں دے گئے؟ بولے میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو موثر ابلاغ کا گفٹ عطا کیا ہے۔ میں یہ نسخے آپ کو اس لیے دے رہا ہوں کہ شاید ان سے استفادہ کر کے اپنی تحریروں میں قرآن کریم کے اصلی پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں گے۔''

صاحبو! ممتاز نے وہ دینی کتب بھی ضرور پڑھی ہوں گی لیکن اس نے کتاب زندگی اس انہماک سے پڑھی ہے کہ وہ شارح حیات ہو گیا ہے اس کی بات میں اثر ہے کیونکہ وہ سیدھے سادے انداز میں عوام کے idiom میں بات کرتا ہے۔اس فکر میں نہیں رہتا کہ کہیں محاورہ بگڑ تو نہیں گیا، روزمرہ سے اظہار ہٹ تو نہیں گیا۔

اپنی زندگی کے آخری دور میں مفتی نے اپنے مطالعہ، اپنی تحریر اور اپنی سوچ کا رشتہ قرآن سے جوڑ لیا لکھتا ہے ''صاحبو! قرآن ایک حیرت انگیز کتاب ہے ایسی کتاب جس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہم عام مسلمان سمجھتے ہیں کہ قرآن مسلمانوں کی کتاب ہے۔نہیں ایسا

نہیں یہ کتاب تو نوع انسان سے مخاطب ہے۔ صاحبو! قرآن ایک انقلابی کتاب ہے، جب چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی انقلابات کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ تخریبی انقلاب نہیں بلکہ تعمیری انقلاب قرآن کا نزول انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلابی واقعہ تھا۔ قرآن سے پہلے کسی مذہبی کتاب نے عقل وخرد اور علم وتحقیق کو اتنا بلند مرتبہ نہیں بخشا۔ قرآن کا رویہ حیرت انگیز ہے۔ وہ علم وحکمت کا خزانہ ہی نہیں بلکہ سائنسی علوم کا سرچشمہ بھی ہے۔"

اب کچھ ذکر ممتاز مفتی کی ریڈیو کے لیے لکھی گئی تحریروں کا۔

سال ہا سال مفتی نے آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھل اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے لیے لکھا۔ اس کی ان ریڈیائی تحریروں کی صوتی ذرائع ابلاغ میں بہت اہمیت تھی لیکن خود ممتاز مفتی نے ان کو ادب نہیں سمجھا۔ یہ تحریریں ریڈیو کے سکرپٹ سیکشن میں بھی محفوظ نہیں۔ نہ ممتاز نے ان کو اپنے پاس محفوظ کیا۔ (ان تحریروں کے مسودہ جات محفوظ ہیں۔ نجیبہ عارف) مفتی نے تراڑ کھل کے سٹیشن سے فیچرز کی صورت میں بہت کامیاب پروگرام نشر کیے۔ ان نشریات میں مفتی پروڈکشن پر بہت توجہ دیتا تھا۔ فیچرز کی صورت میں طویل عرصے تک مفتی "آئینہ" کے عنوان سے پروگرام نشر کرتا رہا۔ "آئینہ" میں کشمیر میں بھارتی سامراج کے خدوخال نمایاں کیے جاتے ہیں۔ ایک پروگرام مفتی نے "مہا سبھائی بھارت کی نئی پستک" کے عنوان سے شروع کیا جس میں ایک متعصب ہندو ٹیچر بچوں کو قاعدہ پڑھاتا تھا۔ بچو! میم سے مُسلے، میم سے ملچھ مُسلے، میم سے مہا بھارت۔ وغیرہ وغیرہ اس پروگرام کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ چوہدری غلام عباس اور گورنر پنجاب نے تراڑ کھل کے سٹیشن ڈائریکٹر کو فون کر کے مبارک باد پیش کی۔

ممتاز مفتی اپنے ریڈیائی مسودات کو اپنی ادبی تخلیقات میں شمار نہیں کرتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ممتاز مفتی جیسا بڑا ادیب جو بھی لکھے وہ ادب ہی ہوتا ہے، گو اس کی صنف ادب کا تعین دشوار ہوتا ہے۔ کاش آزاد کشمیر ریڈیو اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے کوئی پُرجوش کارکن یہ فرض رضاکارانہ طور پر اپنے ذمہ لے۔ ممتاز مفتی کے ریڈیو کے لیے لکھے مسودات کو جمع کریں۔ ریڈیو پاکستان کی انتظامیہ ان کا انتخاب کتابی صورت میں چھاپ

دے۔ یہ انتخاب نہ صرف اس عظیم ادیب کے ایک تخلیقی رُخ کو نمایاں کرے گا بلکہ نوجوان لکھنے والوں کی تربیت کا ذریعہ بھی بنے گا۔ ریڈیو پر ممتاز مفتی کا یہ ایک قرض ہے۔ دیکھیں ریڈیو یہ قرض ادا کرنے کے لیے کب کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنی تخلیقی زندگی کے اہم سال ریڈیو کے لیے وقف کر دیے تھے کشمیر کی آزادی کے مقدس مشن کی خاطر۔

-☆-

نذیر احمد

ممتاز مفتی کی شخصیت نگاری

خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری بہت کم عمر صنفِ ادب ہے۔ اتنی کم عمر کہ ابھی تک نہ گنتی میں ہے نہ شمار میں۔ اصنافِ ادب سے متعلق اکثر کتابیں، مضامین اور بحثیں اسے بھول جاتے ہیں اس صنف کا صحیح نام کیا ہونا چاہیے، یہ مسئلہ بھی فی الحال زیرِ بحث ہے اتنا سا اتفاق سامنے آیا ہے کہ سوانح عمری سے یہ صنف مختلف ہے۔ اسے خاکہ نگاری کہا جائے، مختصر سوانح یا شخصیت نگاری ابھی یہ طے ہونا باقی ہے۔ نقد و نظر کی دنیا میں اس صنف کی جامع و مانع تعریف پر بھی کوئی ایسی قابل قبول اور معتبر رائے سامنے نہیں آئی۔ فن اور فیصلے میں شامل اپنے ایک نہایت عمدہ مضمون میں یحییٰ امجد کا بیان ہے کہ:

> ''خاکے میں تو کسی شخصیت کو جیسی وہ ہوتی ہے من و عن ایسا ہی پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے اچھا یا برا یا کچھ اور ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی زندگی کے مختلف واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری فنی مہارت سے اُن کی ترتیب قائم کی جاتی ہے اور یوں زندہ شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔ اچھے خاکہ نگار کا نقطۂ نظر ضرور ہمدردانہ ہوتا ہے لیکن حتی الوسع جانبدار ہی رہتا ہے۔''

فرض کر لیا گیا ہے کہ شخصیت ایک جامد شے ہے، جو سامنے پڑی ہے، میز یا کرسی کی طرح۔ بنی بنائی مکمل اسے جیسے وہ ہے پیش کر دیا جائے اور پیش کش میں حسب توفیق کوئی چاشنی بھر دی جائے اگر یحییٰ امجد کی تعریف کو صحیح مان لیا جائے تو توقع پیدا ہوئی کہ جو کوئی بھی ابوالاثر حفیظ جالندھری یا سید ضیاء جالندھری کی شخصیت پر لکھے گا اس کے نتیجے میں ان کی

شخصیتیں جیسے کہ وہ ہیں سامنے آجائیں گی۔ واقعتاً ایسا نہیں۔ مختلف خاکہ نگاروں نے ان شخصیتوں کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات اور احساسات بیان کیے ہیں۔ یحیٰ امجد کی تعریف اتنی مانع ہے کہ بہت سی تحریریں جنہیں عام طور سے خاکہ نگاری میں شامل کیا جاتا ہے وہ خارج ہو جاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق کتاب چند ہمعصر، مولانا ابوالکلام آزاد کی چیدہ شخصیتیں، شوکت تھانوی کی شیش محل، رئیس احمد جعفری کی دید شنید اور چراغ حسن حسرت کی مردم دیدہ، خاکہ نگاری کے ذیل میں آتی ہی نہیں۔ عصمت چغتائی کا ''دوزخی'' درجہء کمال سے نیچے گر جاتا ہے اور رشید احمد صدیقی کا ''ایوب عباسی'' اُردو کے بہترین خاکے کے طور پر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میں شامل خاکوں میں نفسیاتی تجزیوں کی کمی بتائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر انور سدید کی تعریفیں یحیٰ امجد کی تعریف کے مقابلے میں اتنی جامع نہیں کہ کسی شخصیت کے بارے میں ہر مختصر تحریر چاہے اس کا انداز کچھ ہی ہو خاکہ نگاری میں شامل ہو جاتی ہے۔ اگر مصنف کے لیے جو اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں وہ بھی ہنوز نامکمل اور غیر واضح ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تنقیدی اصول وضوابط کا انحصار تخلیقات کے عمیق مطالعے پر ہوتا ہے۔ ان کو قائم کرتے کرتے اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ اس دوران میں تخلیق کار اپنی روش بدل لیتے ہیں یا کوئی توانا تخلیق کار فنی حدود کو ازسرِ نو متعین کرانے کا سبب بن جاتا ہے اور پہلے سے طے اصول وضوابط پیچھے رہ جاتے ہیں خاکہ نگاروں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس صنف کو سرسبز و شاداب کر دیا ہے اور اس کا دامنِ گراں مایہ اضافوں سے بھر دیا ہے مقابلتاً تنقید مُرجھائی مُرجھائی سی ہے۔

ممتاز مفتی نے اس میدان میں جو غیر معمولی اضافے کیے ہیں وہ مطالعے، مشاہدے اور ان کی تخلیقی زرخیزی کی دین ہے۔ شخصیتوں پر اُن کی پہلی کتاب ''پیاز کے چھلکے'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی جو چوتھی اور آخری کتاب ''اوکھے اولڑے'' ۱۹۹۵ء میں ستائیس برسوں کے دوران میں ممتاز مفتی نے درجنوں مطالعے پیش کیے ہیں، جو اسلوب اور مواد کے اعتبار سے منفرد اور متنوع ہیں۔ مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں چار مجموعوں میں سے تین کا انتساب

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے نام ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ ممتاز مفتی شخصیت نگاری کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

"انسان کی شخصیت ایک گورکھ دھندا ہے، ایک ایسا الجھاؤ جس کا سرا نہیں ملتا"

شخصیت کی گہرائی کی بات کریں تو وہ جادو کے ڈبے کے مصداق ہے ایک ڈبہ کھولو تو اندر سے دوسرا ڈبہ نکل آتا ہے دوسرا کھولو تو تیسرا ڈبے میں ڈبہ، ڈبے میں ڈبہ۔ تضاد کو دیکھیں تو شخصیت فقیر کی گدڑی ہے پیوند ہی پیوند۔ بُنت میں، رنگ میں، کوالٹی میں، شکل میں ہر ٹکڑا دوسرے سے مختلف ہے۔ دُکھ انسانی شخصیت کا جزو اعظم ہے ہماری خوشیاں اور عیاشیاں آنسوؤں کی جھیل میں اُگے ہوئے کنول ہیں۔ انسانی شخصیت کا حیران کن پہلو اس کی پُرکار سادگی ہے۔۔۔ بظاہر ایک رنگ۔ اس ایک رنگ کے پردے میں ہفت رنگی۔

ہمارے ہاں خاکہ نگاری کو شخصیت نگاری کا مترادف سمجھا جاتا ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ خاکہ ایک سپرفیشل لفظ ہے اور اس میں تضحیک کا عنصر موجود ہے۔

میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں اس میں میری نگاہ شامل ہوتی ہے، جو مجھے نظر آتا ہے وہ لکھتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی حتمی سچائی پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا میں تو اپنا سچ لکھتا ہوں۔

ممتاز مفتی کی شخصیت نگاری کی سب سے نمایاں خوبی زیرِ مطالعہ شخصیتوں کی موضوعی اور باطنی دنیا کا تجزیہ ہے باہر سے جو شخص جیسا نظر آتا ہے وہ اس پر نگاہ ضرور ڈالتے ہیں مگر فوراً ہی اس کے باطن میں اُتر جاتے ہیں ان کی نظر اس نقطے پر جا کر ٹھہرتی ہے جسے شخصیت کا مرکزہ کہنا چاہیے جس طرح کی چہرہ نویسی شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں نظر آتی ہے یا جس طرح کا مزاح رشید احمد صدیقی کے ہاں موجود ہے۔ ممتاز مفتی کی لکھی ہوئی شخصیتوں میں ناپید ہے۔

ممتاز مفتی کم و بیش ہر مطالعے کی بنیاد سوانحی تفصیل پر رکھتے ہیں مگر تفاصیل کی ترتیب اس طرح قائم کرتے ہیں کہ مرکزہ فوکس میں رہتا ہے۔ ہر شخصیت کو ایک خاص عنوان کے تحت لکھتے ہیں، جو ایک طرح سے اسے سمجھنے کی کلید ہے یا اس کے اس وصف پر دلالت کرتا

ہے جو ممتاز مفتی کی نظر میں سب سے نمایاں ہے، مثلاً پروین عاطف کے لیے میلہ گھومنی اور عکسی مفتی کے لیے لوک ورثہ۔

خارج سے داخل کی طرف جو رجحان مفتی کی شخصیت نگاری میں پایا جاتا ہے اس کی مثال ان کی کتابوں سے بغیر کوشش کے مل سکتی ہے۔ کسی شخصیت کو اٹھا کر دیکھ لیجیے ابن انشاء کو لے لیں ابن انشاء کی شخصیت پر ممتاز مفتی نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں لکھا پھر انشا کی موت کے بعد ترامیم کیں کچھ اضافے کیے یہ تحریر سوانحی معلومات سے بھری پڑی ہے۔ انشاء کی پوری زندگی سے منتخب واقعات ہیں بچپن کی غربت اور محرومیاں ہیں اس کے کیریئر کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ گمنامی اور شہرت کا تذکرہ ہے۔ شاعری اور کالم نویسی پر تبصرہ ہے۔ ذاتی زندگی کے راز بے نقاب کیے ہیں۔ عشق کی کہانی ہے دوستوں کے حوالے ہیں۔ مگر یہ سب سیڑھیاں ہیں اس خلا میں داخل ہونے کے لیے جہاں انشاء کا اصل میں بسرام تھا۔ بیراگ اور جوگ کی کیفیت جو اس کی شاعری کا منبع و مصدر ہے۔ انشاء کی شخصیت ایک پیکر میں سمٹ جاتی ہے۔ جلتا بجھتا مٹی کا دیا جو بجھ جاتا تو گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ جلتا تو بھور سماں بندھ جاتا۔ بنیادی طور پر وہ گھپ اندھیرا تھا ایک فرد کھویا کھویا دکھی اکیلا اور گونگا۔

پروین شاکر کی شخصیت دیکھیے آؤٹ لائن دلربا ہے۔ یہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود پروین کے لیے بھی مگر ممتاز مفتی زیادہ تر ان لائن سے سروکار رکھتے ہیں۔ فنِ مصوری کی اصطلاحیں استعمال کرنے کی وجہ سے انہیں لفظوں پر لکیروں کی برتری کا احساس ہوتا ہے اور وہ مصوروں کا یہ خیال اپنے مصور اور مجسمہ ساز دوست آذر زوبی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ لفظوں کے مقابلے میں لکیریں نہایت بلیغ ہوتی ہیں۔ خود زندگی لکیروں سے عبارت ہے مگر ممتاز مفتی کو تو لفظوں پر قدرت حاصل ہے۔ سو وہ پروین کی شخصیت کی تین پرتیں بیان کرتے ہیں۔

”پہلی پرت دیکھو تو لطافت ہے معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔ دوسری پرت ذہنی پختگی، مردانہ جرأت اور Cruel realism۔ تیسری پرت، دکھ کی ایک بے نام بھیگ جو ساری شخصیت میں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر ایک لفظی پیکر ابھرتا ہے

جو سارے تاثر کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

پروین شاکر کی شخصیت:

''دُکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ''

چند ایک شخصیتیں ایسی ہیں جن میں غنائیت کا عنصر ہے جذبے الفاظ کے دروبست، جملوں کی اٹھان اور ان کے تواتر میں۔ اس ضمن میں وہ ادا جعفری، شبنم شکیل اور پروین شاکر کی شخصیتوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں تجزیہ ہے سوانحی تفصیل ہے مگر مجموعی طور پر اظہار و ابلاغ میں غنائیت کا تاثر ہے۔ شبنم کے بارے میں چند جملے سنئے۔

''درحقیقت شبنم کی شخصیت کی بنیادی خصوصیت کو ملتا ہے وہ کومل ہے، نازک ہے فریجائیل ہے۔ لگتا ہے تیز ہوا چلی تو پتی پتی ہو کر بکھر جائے گی۔ پنجابی میں اسے کچ دے گلاس ورگی کہتے ہیں۔

موسیقی کی اصطلاح میں کومل کا مطلب ہے آدھی سُر یعنی ٹوٹی ہوئی سُر۔ موسیقی میں دو قسم کی سُریں ہوتی ہیں ٹوٹ اور ٹوٹی ہوئی تیور اور کومل۔ پتہ نہیں آدھی سُر کیوں میٹھی ہوتی ہے، کیوں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ گھل مل جاتی ہے۔ شبنم ٹوٹی ہوئی آدھی سُر ہے۔''

ممتاز مفتی نے ادا جعفری کے بچپن کا کھوج لگایا ہے اس کی زندگی کے احوال پیش کیے ہیں۔ ہزار پردوں میں چھپی گونگی، تنہا اور سہمی ہوئی شاعرہ کو تلاش کیا ہے، جو ایک انجانی سمت سے منسلک سراسر روحانی اور وجدانی کیفیت میں مبتلا ہے، اور اب دیکھئے ادا جعفری کے تخلیقی عمل کے خدوخال۔

''وقت آنے پر ریسیور میں جھنجھناہٹ ہو جاتی ہے ایک بے نام اضطراب گھیر لیتا ہے پھر رات کی گہری خاموشی میں 007 بولتا ہے۔ خاک اٹھتی ہے، لکھنے لگتی ہے، سوچتی نہیں پرکھتی نہیں لکھے جاتی ہے پھر وقفہ آ جاتا ہے سو جاتی ہے پھر جاگتی ہے لکھتی ہے جب صبح ہوتی ہے تو پڑھتی ہے ترتیب دیتی ہے صاف کرتی ہے پھر سرشاری کیفیت چھا جاتی ہے۔

یہ الہامی کیفیت جذبات کی شدت میں پیدا نہیں ہوتی خارجی دُنیا کی چکی کھٹا کھٹ

چل رہی ہو تو رابطے کے امکانات دھندلے پڑ جاتے ہیں شوراشوری میں ریسیور کام نہیں کرتا۔ لاتعلقی ہو گہرا سکون ہو تو رابطہ پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

بعض شخصیتیں جو ممتاز مفتی نے لکھی ہیں وہ ایک عمر تک ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں انہوں نے ایسی شخصیتوں کو زندگی کے جھمیلوں میں الجھنے اور زرخیز تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رکھا ہے۔ نہایت پیار سے ان کو اداؤں یا ان کے اوصاف کو رقم کیا ہے۔ ایسی شخصیتوں میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد سرِ فہرست ہیں۔ بالعموم ممتاز مفتی نے ایسے ادیبوں کی شخصیتیں لکھی ہیں جو نامساعد حالات سے نبرد آزما رہے ہیں۔ جنہیں پہلے سے معلوم اور طے شدہ راستوں پر چلنا منظور نہ تھا، جو اپنے انتخاب پر مصر رہے اور جن میں اتنی قوت تھی کہ اپنا راستہ خود بنائیں اور اپنے خون جگر سے اپنی تخلیقات کو سینچیں۔

ہر کہیں ممتاز مفتی کو تخلیق کے سرچشموں کی تلاش ہے وہ تفصیل سے تفصیل جوڑتے ہیں زندگیوں کے واقعاتی چوکھٹے استوار کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں قدسیہ بانو کیسے بن گئی۔ اشفاق، اشفاق احمد کیسے بن گیا، عنایت اللہ آذر ذوبی کیسے بن گیا، ثنا اللہ میراجی میں کیسے ڈھل گیا، سعادت حسن منٹو کیسے بن گیا اور ممتاز حسین ممتاز مفتی کیونکر بن گیا۔ تحیر کا تاثر ممتاز مفتی کے ذہن پر چھا جاتا ہے اور وہ اس کو اپنے قاری تک پہنچاتے ہیں۔ دیکھ کیسے کیسے پس منظر سے کیسی کیسی زمین سے تخلیق کا اکھوا پھوٹا ہے۔ قدرت نے کیا کیا جتن کیے ہیں ان لوگوں کو بنانے میں جنہیں ہم اپنے خوابوں کے صورت گر کہتے ہیں۔

ممتاز مفتی کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے نہ اپنے بارے میں نہ دوسروں کے بارے میں۔ بڑے صاف گو اور پُر اعتماد ہیں کہ رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ پوری آزادی سے بات کرتے ہیں مگر ہمدردی اور مہر و وفا کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اندازِ بیان ان سے خاص ہے تخلیقی رو میں لکھتے ہیں اور ہم سب کا دل موہ لیتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت لکھتے ہوئے ان کا اعتماد البتہ ڈانواں ڈول ہے۔ ان کا تحیر تجربے اور مشاہدے کے ایسے علاقے میں داخل ہوتا ہے کہ وہ اسے جتنا بیان کرتے اور کھولتے ہیں اسرار کے پردے اتنے ہی دبیز ہو جاتے ہیں اور وہ عجز کا اظہار کرتے ہیں۔

ان کے شائع شدہ مجموعوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی نے سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں اپنے دوست محمد عمر کی شخصیت پر لکھا اور سب سے آخر میں سید ضمیر جعفری پر۔ ان کے انتخاب میں منٹو سے لے کر شہابہ گیلانی تک افسانہ نگار شامل ہیں۔ شاعروں کا ایک سلسلہ ہے جن میں سید ضیاء جالندھری شامل ہے، آذر زوبی جیسا مصور اور مجسمہ ساز ہے، طفیل نیازی جیسا لوک گائیک ہے، حسام الدین راشدی اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے محقق ہیں، احمد بشیر، سید شبیر شاہ جیسے بلند پایہ صحافی اور مصنف ہیں اور ضمیر جعفری اور فکر تونسوی جیسے طنز و مزاح کے تخلیق کار ہیں گویا رنگا رنگ شخصیتوں کا ایک دلپذیر اجتماع ہے اور ان کے حوالے سے ایک طویل عہد سے متعلق ہماری ادبی و ثقافتی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔

-☆-

عبدالحمید اعظمی

تلاش کا متلاشی

جب ممتاز مفتی ٹرسٹ نے مجھے مفتی پر کچھ لکھنے کی دعوت دی تو مجھے مفتی کے ان گنت مشوروں میں سے ایک بڑی شدت سے یاد آنے لگا۔ مرحوم کو جب کبھی موقع ملتا مجھے کچھ نہ کچھ لکھنے کی تلقین بڑی شدومد سے کرتے۔ میرا ایک ہی جواب ہوتا:

''مفتی لکھنا فرصت کا کام ہے، جو فی الحال ناپید ہے۔''

''تمہاری مصروفیات مجھ سے چھپی تو نہیں ہیں ایک دو جملے لکھنے کی فرصت تو مل ہی سکتی ہے روز کچھ نہ کچھ لکھ لیا کرو۔ ورنہ محض منہ زبانی رہ جاؤ گے۔''

''مفتی ان جملوں میں ربط نہیں ہوگا۔''

''یار اس ربط کے خبط کو چھوڑو، لکھ، لکھ، لکھ۔''

آج ان کے اسی مشورے پر ایک بار پھر عمل کر رہا ہوں۔ ربط پیدا کرنا قارئین کا کام ٹھہرا۔ وہ ان ننھے منھے روشن لفظوں سے تصویر خود تیار کریں۔ ہوسکتا ہے وہ اسی ممتاز مفتی کی شبیہ ہو جسے وہ پہچاننے کی سعی میں مصروف ہیں۔

مفتی کے والدین کی مردم شناسی قابل رشک ہے۔ بچے میں نہ جانے انھیں کیا نظر آیا کہ انھوں نے اس کا نام ممتاز رکھ دیا۔ آج یہ عالم ہے کہ اس کے ممتاز ہونے میں کسی کو شک نہیں ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مفتی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ''نام بہت اہم ہوتے ہیں اور وہ افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔'' مفتی کے خیال میں نام اسم معرفہ ہی نہیں ہوتے بلکہ صوتی اثر اور مفہوم کے لحاظ سے کچھ بھاری بھرکم اور کچھ زیادہ ہی گاڑھے ہوتے ہیں اور کچھ حلق میں یوں پھنس جاتے ہیں جیسے مچھلی کا کانٹا۔ ان کا بولنا حلق پر ظلم کے مترادف ہوتا ہے۔ غضنفر ایسا نام

ہے جسے بقول مفتی اگر بار بار بولیں تو یقیناً آپ کو ٹانسلز کا عارضہ لاحق ہو جائے گا۔ اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں کہ ”کراچی میں میرے ایک ہم کار تھے کہکشاں حقانی میں ان کے ساتھ چھ مہینے رہا آج تک گلے کا کوا سوجا ہوا ہے۔“

مفتی کا نام ممتاز حسین جس میں سے ہلکی سی تبدیلی کر کے دنیا کے سامنے ان کی شخصیت نے ایک نیا رُوپ دھار لیا۔ ایک تحریر میں اس کا انکشاف یوں کیا ہے ”جن دنوں مجھے افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا۔ ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا۔ خوش قسمتی سے مدرسے میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ مگر اردو جریدوں میں ممتاز مفتی چھپتا تھا۔ چونکہ لوگوں سے ملنے کی عادت نہ تھی اور ادبی محفلوں میں نہ جاتا تھا اس لیے عرصہ دراز تک پردہ پڑا رہا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ماسٹر محمد حسین افسانے لکھنے کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے۔“

مفتی کا مشورہ دل کے کسی نہ کسی گوشے میں کبھی نہاں اور کبھی عیاں رہتا۔ جب میرا تبادلہ لاہور ہو گیا تو مفتی سے فاصلے نے قربت کی یادوں کو اتنا موثر بنا دیا کہ میں نے ان کے خردہ نویسی کے نسخے پر عمل شروع کر دیا۔ موضوع مفتی ہی کو بنایا۔ کبھی ایک جملہ ہو جاتا کبھی دو چار۔ ایک روز تو پورا پیراگراف ہاتھ باندھے حاضر ہو گیا۔ سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب عدیم الفرصتی کے باوجود دو صفحے سیاہ کر ڈالے تقریباً ایک ماہ بعد مزید لکھنے کا یارانہ رہا۔ شاید مضمون مکمل ہو گیا تھا ایک روز اردو ڈائجسٹ کے مدیر اعلیٰ ہمارے کرم فرما جناب الطاف قریشی صاحب دفتر تشریف لائے تو باتوں باتوں میں ایک مضمون کی فرمائش فرما دی۔ ہم نے دراز سے کاغذوں کا پلندہ نکالا تو معلوم ہوا سرخی کی جگہ خالی ہے جلدی سے ممتاز بیانی کا عنوان جما کر ان کے حوالے کر دیا۔ دوسرے روز قریشی صاحب نے فون پر بتایا کہ اشاعت کے لیے وہ مفتی سے رجوع کرنا چاہتے ہیں کیونکہ شاید کچھ باتوں پر انہیں اعتراض ہو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، ادب کے اکھاڑے میں پہلی بار اترا ہوں، ہو سکتا ہے کوئی داؤ پیچ غلط لگ گیا ہو۔ میں نے کہا آپ ضرور اپنی ادارتی اور صحافتی ذمہ داری نبھائیے۔ حسب توقع مفتی نے بغیر کچھ کہے سنے ان سے کہا کہ میں کون ہوتا ہوں اپنے بارے میں کسی کی رائے پر قدغن لگانے والا اور یہ مضمون شائع ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ مضمون

کی اشاعت کے بعد ہی فون پر فون آئیں گے حمایت ومخالفت کے خطوط کے انبار لگ جائیں گے بلکہ مفتی کے حامیوں اور مخالفوں میں جھڑپیں ہوں گی اخباروں کو گرم گرم سرخیاں اور رسالوں کو تند وتیز مضامین نصیب ہوں گے۔ دنیائے ادب میں وہ زلزلہ آئے گا کہ جس کی شدت ریکٹر سکیل پر دس ڈگری سے تجاوز کر جائے گی۔ سر بہ فلک عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن جائیں گی خام اور پختہ ادیب زخموں سے چور ہوں گے۔ لیکن واحسر تا کہیں سے صدائے بر نہ خواست۔ مایوسی کے عالم میں مفتی کا ایک جملہ کیا بلکہ کئی جملے یاد آ گئے کہ ادیبوں کی ایک پرابلم ہے ہمیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے (محترم ہومیو پیتھی کے نام) ''ہمارا کوئی قاری نہیں ۔۔۔کوئی قاری ہو بھی تو وہ بدنصیب سراسر مجبور ہے کیونکہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے کتاب کی قیمت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کتاب خریدنا ایک اوسط درجے کے آدمی کے لیے ممکن نہیں رہا۔'' (ادب اور ادیب)

جب مختصر عرصے کے لیے تربیت کی غرض سے امریکہ جانا ہوا تو مفتی سے ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے یا وطن اور اہل وطن سے دوری کے سبب ہر شے یادوں کے طاقچوں میں خود بخود سج گئی۔ اور خردہ نویسی کی مشق کا اعادہ ہو گیا روزانہ کاغذ پر دو چار سطریں بطور مشاہدہ ثبت ہونے لگیں واپس ہوا تو ان یادداشتوں کو ترتیب دے کر دیکھا دوستوں نے کہا یہ اچھی خاصی کتاب تیار ہے بہی خواہوں نے طباعت کی دشواریوں کی دل گداز داستانیں سنائیں جسے دل نے تسلیم نہ کیا۔ ایک روز میں نے مسودہ چپکے سے مفتی کے حوالے کر دیا انہوں نے بغیر دیکھے اسے چارپائی پر پڑی کتابوں پر رکھ دیا۔ مجھ میں ہمت نہ رہی کہ میں کچھ کہتا حسب معمول ادھر ادھر کی باتیں کر کے واپس آ گیا تیسرے روز مفتی نے فون کیا ''مسودہ دے گئے ہو واپس بھی تو لے جاؤ۔ میرے پاس ردی کی کمی نہیں۔'' اسی شام کو مفتی کے پاس حاضر ہو گیا انہوں نے مسودہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولے اس میں میرا لکھا ہوا ایک کاغذ ہے پڑھ لینا۔ لیکن یہاں نہیں، گھر پہنچ کر۔ دیکھا کہ مفتی نے مسودہ پر اپنی رائے لکھ دی تھی جو میری محنت سے زیادہ ان کے مشورے کے کارگر ہونے کا ثبوت تھا۔ لکھا تھا:

''حمید اعظمی کو میں ۱۹۵۰ء سے جانتا ہوں حمید اعظمی میں وٹ اور ہیومر کی بے انداز

صلاحیت ہے۔ لیکن اس نے اپنی صلاحیت کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔'' اس کے بعد اپنے مشورے کے صائب ہونے کے ثبوت میں ابن انشا کا ذکر کیا کہ کس طرح ایک شاعر نے اپنی اصل صلاحیت سے کام لے کر مزاحیہ کالم کو اس قدر اپنایا کہ شاعری پس پشت پڑ گئی انہوں نے پتہ نہیں مجھے یا قارئین کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ'' آج تک حمید اعظمی کی یہ صلاحیت تحریر کی بجائے گفتار میں اظہار پاتی رہی۔ اشفاق احمد نے اپنی تصنیف ''سفر در سفر'' میں اور میں نے اپنے سفرنامے شاہراہِ ریشم میں حمید اعظمی کی مزاح کی صلاحیت کو پیش کیا ہے میں نے شاہراہِ ریشم میں اس کا نام وٹ رکھا تھا۔ اشفاق نے اُسے اعظمی کے نام سے پیش کیا ہے۔''

''اب حمید اعظمی کی پہلی تصنیف ''سفر کم نامہ زیادہ'' منظر عام پر آ رہی ہے مجھے یقین ہے کہ اب اسے بھی طنز و مزاح کی صلاحیت پر یقین آ جائے گا۔ اور قارئین کو بھی۔ میری آرزو ہے کہ یہ اس کی پہلی کتاب ہو آخری نہیں۔''

مفتی کے تبصرہ سے متاثر ہو کر ایک پبلشر نے طباعت کی نہ صرف ہامی بھری بلکہ اس کا پروف بھی دے دیا۔ جسے میں نے ان کی نیک نیتی کا پروف سمجھ کر چوما اور آج تک چوم رہا ہوں۔ حال ہی میں ایک کرم فرما جو بہت دنوں بعد ولایت سے آئے بولے آپ کی کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو گئی یا نہیں۔ میں نے کہا آپ کو پتہ نہیں شاعر نے زیور کے بارے میں کیا کہا ہے:

''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی کہ کتنا خوش نما لگتا ہے دیکھو
چاند بن گہنے زیوروں میں زیور طباعت بھی شامل سمجھئے۔''

مفتی نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تخلیقی صلاحیت پر اسی کی اجارہ داری قائم رہے وہ چاہتا تھا کہ اسے اس قدر عام کر دیا جائے کہ ملک میں گندم اور کپاس کی جگہ اہل قلم کی فصلیں اُگیں۔

ایک بار ''چھڈ یار'' کے سر پھرے آزاد کشمیر کی لیپا ویلی میں مہم جوئی کے لیے پہنچے تو بریگیڈیئر صاحب نے ہمیں اپنا مہمان بنا کر اگلے مورچوں تک پہنچا دیا۔ ایک رات میس میں زبردست ضیافت دی۔ تمام نوجوان افسر جمع تھے۔ مفتی نے بہ حیثیتِ مہمان خصوصی ایک

خوبصورت اور مؤثر تقریر کی جو عمومی رجحان سے ہٹ کر تھی۔ نوجوان مجاہد یہ سمجھے کہ جہاد کا فلسفہ ''کشمیر کا مسئلہ'' شجاعت کی داستانیں بیان کی جائیں گی۔ لیکن مفتی نے توان کی خوابیدہ تخلیقی صلاحیت کو موضوعِ سخن بنایا۔ انھیں گنگناتے چشموں، فلک بوس پہاڑوں اور شاداب درختوں کے ماحول سے متاثر ہو کر ادب تخلیق کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ وردی میں بھی ادب تخلیق ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا ادب سے ڈرنا نہیں چاہیے کیونکہ ادیب وہ ہے جس کے پاس کہنے کو کچھ ہے۔ وہ اس انداز سے کہنا چاہتا ہے کہ بات دوسروں تک پہنچ جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کا ایک زاویۂ نظر ہو اوروں سے ہٹ کر اور منفرد۔ محفل کو مفتی نے اس قدر گرما دیا کہ ہر طرف سے سوالات کی چاند ماری شروع ہوگئی۔ سوال تھا کہ ادب لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس سوال پر سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ مفتی نے ان کے شوق کا اندازہ لگا کر کہا ادب لکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ حقائق جو قریب ہوتے ہیں وہ مانوسیت کی اوٹ میں آ جاتے ہیں۔ آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ یہاں کہ خوبصورتی کا یہاں کے باشندوں کو بالکل ہی احساس نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے مانوس ہیں یقین جانئے مانوسیت ایک بہت بڑا پردہ ہے۔ بہت بڑا۔ دوسری اہم اور قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ ادیب میں ایک ٹرانسفارمر لگا ہوتا ہے وہ سوچتا ہے اور اپنی سوچ کو جذبات کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے پھر وہ شدت کے الاؤ سے بھٹی گرماتا ہے اور گرماتا ہے، دل جلا کر گرماتا ہے۔ یہاں تک کہ فکر جذبات میں ڈھل جاتی ہے پھر وہ اسے ٹرانسمٹ کرتا ہے۔ اسی لیے ادیب کا پیغام دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ مفتی کی باتیں سن کر نوجوان افسروں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ان کی نظروں میں تخلیق کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔ مفتی نے محسوس کر لیا کہ کہیں نوجوان تخلیق کار ادب کے ہفت خواں کو باغ جناح نہ سمجھ لیں۔ اس لیے ان کو آگاہ کر دیا کہ ادیب کو دوسروں کا دُکھ اپنانا اور بیتنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایک من دُکھ سمیٹیں گے تو تحریر میں صرف تولہ بھر سما سکے گا یاد رکھیے دوسروں کا دُکھ اور تخلیق، ایک دُکھ بھرا عمل ہے۔ دفعتاً مفتی کو یاد آ گیا کہ راہ کی مشکلات کا سن کر کہیں نوجوان لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے اپنے اپنے مورچوں میں قلعہ بند نہ ہو کر رہ جائیں۔ اس نے یہ نوید بھی سنا دی کہ تخلیق کے کرب بھرے

ہوئے عمل میں قدرت نے کیف کی ایک شمع روشن کر دی ہے۔ مفتی کی باتیں جاری رہتیں مگر کرنل صاحب نے یاد دلایا کہ افسروں کو اپنے مورچوں پر بھی رات کے اندھیرے میں پہنچنا ہے۔ جس میں سے بیشتر گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ دوسرے روز کرنل صاحب نے مفتی صاحب سے شکوہ کیا کہ آپ نے کیا جادو کر دیا ہے کہ جس افسر کو دیکھو کاغذ قلم لیے بیٹھا ہے۔ تخلیق کی برف پگھلی ہے، شاعروں کا سیلاب آ گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شعرا کی تخلص پر جھڑپیں بھی ہوئی ہیں۔ جس پر بریگیڈیئر صاحب نے یونٹ کے ہر شاعر کو ایک تخلص تمغہء بسالت سمجھ کر عطا کر دیا۔ مفتی نے یہ سُنا تو بولے یار و ذرا پتہ تو کرو تخلص کہیں اس طرح تو نہیں عطا ہوئے کہ غالب (ملٹری) ذوق (ملٹری) جرأت (ملٹری) آتش (ملٹری) وغیرہ کیونکہ بریگیڈیئر صاحب میں بھی تخلیقی صلاحیت نظر آ رہی تھی، لیکن وہ سول افسروں کی طرح اس کا اظہار کرنے سے گریزاں تھا۔ حکومت کی نظر میں یہ اچھا عمل نہیں ہے۔ ادب منہ پھٹ بنا دے گا، جو سرکاری کام میں مداخلت در قابلِ دست اندازی پولیس جرم ہے۔ مسکراتے ہوئے بولے ایک اور بات ہے جو میں نے ان لوگوں کو نہیں بتائی تھی تجھ کو بھی تو ادب کا چسکا لگ چکا ہے سن لے کام آئے گی۔ ماں باپ سے نہیں بنے گی۔ ہم کاروں سے نہیں بنے گی۔ کسی سے نہیں بنے گی۔ مفتی یہ تو بڑی خوفناک بات ہے اس سے بچنے کی ترکیب بھی تو بتا۔ بولے جناب عالی اس کا کوئی دفاع نہیں ہے اس لیے دفع کر اس موضوع کو چل کوئی اور بات کرتے ہیں ایسی جس کا ادب سے تعلق ہو نہ ادیب سے۔

مفتی دوست بنانے میں کمال رکھتا ہے ایک بار چھڈ یار کا ٹولہ محترم ممتاز راشدی کی دعوت پر شہباز قلندر کے عرس پر سیہون شریف گیا وہاں ایک افسانہ نگار سے ملاقات ہوئی انہوں نے ایک خط مفتی کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا "آپ جیسے مخلص دانشوروں کے ساتھ وقت گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی میں مختصر سی صحبت میں اتنا لطف اندوز ہوا کہ مدتوں اس کا تصور دل و دماغ پر چھایا رہے گا۔" یہ خط میرے سرکاری پتے پر آیا تھا۔ میں نے فون پر مفتی کو بتا دیا۔ ارشاد ہوا اپنے پاس ہی رکھو تمہارے کام آئے گا۔ آج حوالہ دے کر اسے ممتاز مفتی ٹرسٹ کے حوالے کر دیا ہے۔

ادب سے مفتی کی ملاقات حادثاتی تھی جو اس کی تنہائی پسندی کا ثمر تھی کیونکہ خود اس کے قول کے مطابق گھر میں اسے کوئی درخورِ اعتنا نہ سمجھتا تھا چونکہ ڈرپوک اور شرمیلا تھا لہٰذا محلے کا کوئی ہم عمر اسے ساتھی بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ سکول میں نالائق ہونے کی وجہ سے کسی گنتی میں، شمار قطار میں نہ تھا۔ ایسے میں ایک بار تالی سن کر اوسان کھو بیٹھا۔ یہ تالی اس کی پہلی کہانی "آپا" پر بجی تھی۔ اور تالی کی ہوس نے قدم کو آگے بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ یہ کہانی ادبی دنیا میں چھپی جس پر رسالے کے مدیر منصور احمد نے تعریفی نوٹ لکھا اور مفتی پلک جھپکنے میں ایک جانا پہچانا ادیب بن گیا۔ اس بے مثال شہرت کو مفتی نے اپنی صلاحیت کا اعتراف نہیں بلکہ حالات اور ادبی ماحول کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں "۱۹۳۶ء میں جب میں نے لکھنا شروع کیا تو پنجاب کا ادبی میدان خالی پڑا تھا چار ایک لکھنے والے تھے کمپی ٹیشن کی کوئی صورت نہ تھی۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ ادب لکھتا ہوں۔۔۔ اس وقت مجھے پتہ چل جاتا کہ ادب میں پاؤں دھر رہا ہوں تو ڈر کر بھاگ اٹھتا کیونکہ ان دنوں ادب میرے لیے دھونس تھی۔"

مفتی نے اُردو میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زبان اسے نہیں آتی لکھنا شروع کیا وہ اُردو کے مزاج کو اپنے خیالات کے اظہار کے لائق نہیں سمجھتا تھا کیونکہ اُردو ایک درباری زبان ہے چونکہ درباری ہے اس لیے بات بڑھا چڑھا کر کرتی ہے بورژوا ہے۔ اس کی جڑیں عوام میں پیوست نہیں۔ جبھی تو اُردو میں نہ کوئی لوک گیت ہے نہ لوک کہانی۔ اسی لیے مفتی کی نظر میں اہل زبان خائف ہیں کہ اگر کلچر کا مرکز گاؤں قرار دے دیا گیا تو زبان کے ہتھیار کی دھار کند ہو جائے گی وہ نہتے ہو کر رہ جائیں گے۔ مفتی اُردو کو کھینچ کر گاؤں کی طرف لایا۔ زبان میں ٹھیٹھ دیہی الفاظ، محاورے اور روزمرہ بے دھڑک استعمال کرنا شروع کر کے، دیہی ماحول اپنا کر سب کو اپنا بنا لیا مفتی نے نیاز مندان لاہور کی طرح زبان کے لیے ڈانگ سوٹا ہاتھ میں نہیں اٹھایا۔ اردو کی یہ خدمت اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اسی لیے جب اس کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے ایوارڈ ملا تو اس نے وہ ٹرافی ڈرائنگ روم میں نمایاں جگہ پر سجا دی۔ وہ خوش تھا کہ انجمن نے اس کے کمال کا نہیں بلکہ اس کی اردو کا

اعتراف کیا ہے۔

اس کو عادت اپنانے سے کبھی کوئی عار نہ تھا۔ وہ جس بات سے متاثر ہوتا یا اسے لطف آتا اسے عادت بنا لیتا ابتدائی زمانے یعنی عنفوانِ شباب میں محبت عادت تھی پھر لکھنا عادت ہوگئی پھر پڑھنے کی لت پڑ گئی افسانے لکھ کر سرخروئی سے تسکین نہ ہوئی تو پان کھا کر ہونٹ اور دانت سرخ کر لیے یہ عادت اس قدر راسخ ہوگئی کہ "چھڈ یار" کی مہم کے سازوسامان میں پان کے پتے، کتھا، چونا اور چھالیہ بھی سرِ فہرست ہوتے اور مفتی ہر صبح ناشتے سے قبل ان پتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہر ایک کا بہ غائر معائنہ ہوتا جہاں کسی پتے پر ہلکا سا داغ بھی نظر آتا مونچھیں کترنے والی قینچی سے اسے علیحدہ کر دیا جاتا یہ کام وہ ماہر سرجن کی طرح کرتے تھے۔ کیا مجال صحت مند حصے پر کوئی زد پڑے۔ پان پھیرنے کی یہ عادت امیر خسرو کی پہیلی یاد دلاتی تھی کہ گھوڑا کیوں اُڑا، پان کیوں سڑا، پھیرا نہ تھا۔ ایک بار گلگت کی وادیوں میں مفتی کے پتے ختم ہوگئے۔ دو چار لوگوں سے پوچھا انہوں نے نہ صرف اس کی فروخت سے بلکہ اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ بعض نے تو حیرت زدہ ہو کر پوچھا آپ لوگ کچے پتے کھاتے ہیں اور پھر ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں کیا گھاس کھا گئے ہو۔ اب تو مفتی کی کیفیت اور تڑپ قابلِ دید تھی ایک جگہ شہتوت کے سائے میں وہ بیٹھ کر مراقبے میں چلے گئے دفعتہً نظر اٹھا کر درخت کی طرف دیکھا اور حکم دیا کہ اس کا نرم و نازک پتہ فوراً پیش کیا جائے۔ پتے کو غور سے دیکھا پانوں کی تھیلی سے سارا سامان نکالا اور اس پر کتھا چونا ایک ماہر بیوٹیشن کی طرح لگا دیا۔ چھالیہ بھی چھڑکی اور یہ بیڑا منہ میں دبا کر ایسے خوش ہوئے جیسے کوئی سلطنت ہاتھ آ گئی ہو۔ راستے بھر مختلف درختوں کے پتے آزمائے گئے ایک مقام پر جنگلی گلاب کی بیل اپنے جوبن پر تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں پر تجربہ اس قدر کامیاب رہا کہ مفتی نے اسے پان کا نعم البدل قرار دیا اور باقی مدت یہی برگِ گل پان کے مصالحوں کا نشانہ بنا رہا۔ مفتی کی ایک اور عادت کا ذکر اشفاق احمد نے "سفر در سفر" میں کیا ہے کہ وہ جس کمرے میں جس بستر پر سوتا تھا صبح چار پانچ بجے وہاں سے اُٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر پھر سو جاتا ہے عام طور پر اس کا سونا نمبر دو فرش پر ہوتا ہے۔ اور اگر فرش پر

قالین یا دری وغیرہ نہ بچھی ہو تو وہ دوسرے کمرے میں ٹرنکوں پر میز پر یا کرسیوں پر جا کر سو جاتا ہے پھر وہ دن چڑھے بیدار ہوتا ہے اور ننگے پاؤں ہر کمرے میں ہر برآمدے میں گھومتا ہے اس وقت تک جب تک کہ اسے چائے کا ایک بڑا مگ نہ مل جائے چائے پینے کے بعد اسے اپنے اردگرد کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ خواب کی وادی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتا ہے اگر اس کی یہ ڈرل پوری نہ ہو تو سارا دن بیزار بے چین اور تنگدل رہتا ہے۔

مفتی کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب کوئی دوست سفر پر جانے کی اطلاع دیتا تو وہ یہی کہتے کہ میں بھی پا بہ رکاب ہوں، پتہ نہیں واپس آؤ گے تو میں ہوں یا نہ ہوں۔

یار مفتی یہ حکم کیسے لگا سکتے ہو۔ سب ہی پا بہ رکاب ہیں۔ کسے پتہ کس کے کوچ کا حکم آ جائے۔ میری طرف دیکھو۔ یہ دواؤں کی شیشیاں دیکھو، گولیاں دیکھو، میرے دیکھنے سے کیا ہوگا۔ ٹکٹ تو کہیں اور سے کٹتا ہے۔ جہاں کا نظام عمر کا پابند نہیں۔ یہی مکالمے اس وقت بھی دہرائے گئے جب میں نے فون پر بتایا کہ میں عزیزوں سے ملنے چند ہفتوں کے لیے ہندوستان جا رہا ہوں۔ واپسی پر سمجھوتہ ایکسپریس پکڑنے سویرے سویرے دلی پہنچے اور اپنے ایک عزیز کے یہاں جامعہ نگر میں دن گزارنے کے لیے ٹھہر گئے۔ ان کی بچی جامعہ ملیہ میں اردو میں ایم۔اے کر رہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ کل آپ کے ایک پاکستانی ادیب کی تعزیت کے لیے جامعہ ملیہ میں جلسہ ہوا تھا۔ بڑا کامیاب جلسہ تھا۔ ''ادیب کون تھا؟'' بولی ''ممتاز مفتی'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''تو اب کی بار سچ کر دکھایا۔'' آپ اُن سے واقف ہیں۔ جی بیٹے میں ہی نہیں آپ کے ہمسائے میں آرام فرما مرزا غالب بھی ان سے واقف تھے۔

کیا وہ ان کے ہم عصر تھے؟

یوں ہی سمجھ لو، تمام بڑے ادیب ایک دوسرے کے ہم عصر ہوتے ہیں، غالب اپنی محبوب زبان یعنی فارسی میں مفتی ہی کی ترجمانی فرما گئے تھے:

نگہم نقب بہ گنجینہ دلہامی زد
مژدہ باد اہل دیارا کہ زمیداں رفتم!

کسی زمانے میں مفتی کو محبت کرنے کی عادت تھی، بی۔ اے میں تھا تو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا بلکہ یہ آزار وہ لگا بیٹھا۔ عشق میں کامیابی اور ناکامی سے اسے سروکار نہیں تھا اسی لیے وہ ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ ''زندگی بھر میں نے کئی محبوباؤں سے عشق کیا تھا۔ زندگی بھر خواہش کی انگیٹھی سلگا کر بیٹھا اسے پنکھا کرتا رہا تھا زندگی بھر بڑی محنت سے جگہ جگہ عشق لگاتا رہا۔'' بالوں میں سفیدی اور چہرے پر جھریاں نمودار ہونے پر بھی مفتی کی یہ عادت قائم و دائم رہی کیونکہ مفتی کا فلسفہ تھا کہ ''بوڑھے دراصل بوڑھے نہیں ہوتے وہ انسان ہوتے ہیں سوسائٹی کا خوف اخلاقی اقدار اور لوک لاج بوڑھوں کو ان کی نارمل زندگی بسر کرنے نہیں دیتی چھوٹوں کی تنقید اور اپنے ہم عصروں کے طعن سے خوفزدہ ہو کر بوڑھا ایسی زندگی جینے پر مجبور ہو جاتا ہے یوں سمجھ لیجیے بڈھا نہیں ایک ماچس ہے جسے گھر والوں نے پانی کی بالٹی میں ڈال دیا ہے۔ کھوکھا بھی گیلا تیلیاں بھی گیلی۔'' مفتی کی گیلی ماچس دھرم پورہ لاہور کی ایک نانی دادی کی آنچ سے ایسی خشک ہو گئی کہ اسی کے در پر رہنے کی ٹھان لی۔ اسلام آباد جانے کے نام سے بخار چڑھ جاتا۔ پوتے، نواسے، نواسیاں سب طاقِ نسیاں کی زینت ہو گئے نصیحت کرنے والے احباب زہر لگنے لگے۔ وہ تو اشفاق کا خدا بھلا کرے کہ اس نے مفتی کے اس عشق کا تریاق پیدا کر کے اس عادت کا قلع قمع کر دیا بھڑکتی آگ پر جانے پانی چھڑکا یا کاربن ڈائی آکسائیڈ پھینکی اور وہ دن بھی آیا جب مفتی اسلام آباد آ گیا۔ مفتی کی ایک عادت اور تھی کہ وہ اپنے مشوروں کو ہمیشہ درست اور قابل عمل سمجھتے تھے۔ ایک زمانے میں راولپنڈی ریڈیو سے ایک فیچر پروگرام نشر ہوتا تھا جس کی تحریر مفتی کی تھی۔ پیشکش عکسی کی اور فنکاران کی اپنی پسند کے ہوتے تھے۔ پروگرام پروڈیوسر میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کا ایک نقطہ بھی ادھر سے ادھر کرتا اس سے اوپر کے افسر بھی مسودہ اسی طرح پیش کر دیتے تھے۔ میں ریڈیو کی پالیسی کے مطابق اس میں ردوبدل کر دیتا تھا، جو مفتی کو گوارا نہ ہوتا تو وہ دلائل کے انبار لگا دیتے لیکن حرفِ آخر میرا ہوتا اس لیے انہیں تبدیلی بادل ناخواستہ منظور کرنا پڑتی اسی لیے میرے بارے میں ان کی رائے تھی کہ اعظمی افسر ڈاڈھا مگر ماتحت بڑا پیارا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ''خدا نہ کرے آپ کو اس کے ماتحت کام کرنا پڑے اگر وہ آپ کا ماتحت بن

جائے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہو گی حاکم کی حیثیت سے وہ مسلسل تیوری ہے۔ لیکن ساتھی کی حیثیت سے باغ و بہار شخصیت ہے مسلسل مفرح مسکراہٹ خدمت گار مٹھاس کا ایسا مرتبان جس سے پھواڑ اڑتی رہتی ہے۔'' ایک دن مفتی نے مجھے گھر پر فون کیا بیوی سے بولے اعظمی گھر پر کس طرح رہتا ہے انہوں نے کہا اچھی طرح۔ دوسرے روز ملے تو فون کا ذکر کیا کہ میں نے تیری حقیقت تیری بیگم پر واضح کر دی ہے۔ میں نے کہا، مجھے پتہ ہے ان کے جواب کا بھی پتہ ہے، مگر اس نے یہ جواب کیوں دیا؟'' مفتی تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ ارے میں وہاں ماتحت بن کر رہتا ہوں۔'' بڑے زور سے ہنسے اور زیر لب کہا ''میرا بھی یہی اصول ہے۔''

مفتی کی عادت ہے کہ وہ تن پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہے اور باطن میں گہری۔ اس لیے ہر شے میں ہر واقعہ میں ہر حادثے میں تیسری جہت دریافت کر لیتا ہے اس پر ایمان لاتا ہے اور دوست احباب کو بھی اسے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ تشکیل پاکستان اور تعمیر پاکستان میں اسے یہی تیسری جہت ایک ایسا جذبہ اور ایقان عطا کرتی ہے، جس کی وجہ سے مفتی کو وطن عزیز کا مستقبل تابناک اور دنیا کے لیے ایک قیمتی سرمایہ نظر آتا۔ سرکاری ملازمت کے دوران ایوان صدر میں آئے ہوئے خطوط کا پڑھنا اور انہیں پیش کرنا اس کے فرائض منصبی میں داخل تھا ایسے خط بھی اسے ملتے تھے جو قصیدہ گوئی سے خالی تھے ان کا موضوع پاکستان ہوتا پاکستان کی خصوصی عظمت، پاکستان سے رسول خدا کا التفات، پاکستان پر اللہ کی خاص برکت اور رحمت ایسے خواب کا ذکر کرنے والے لوگ بھی ملے جنہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ مسجد نبوی سے بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دور نکل گئی اور پرلے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔ اس کے ایک دوست نے بتایا کہ اس نے لندن میں ایسی کتاب دیکھی ہے جس میں تحریر تھا کہ شاہ لطیفؒ (بری امام) نے نہ جانے کتنے سو سال قبل فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہو گا جو دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا۔ ۶۵ء کی جنگ کے دوران عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں قدم قدم پر کرامات کے تذکرے تھے سفید ریش بڈھے توپوں کے گولے اور بموں کو پکڑ پکڑ کر ہوا

ہی میں ضائع کر دیتے۔ مفتی ان خبروں کو سچ سمجھنے لگا اس کا کہنا تھا کہ اس کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں حربی ساز وسامان اور فوجوں کی کثرت کے سبب یہ جنگ ہار جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا مفتی کی عقل ملامت کرتی مگر تیسری جہت نے اس کے ہوش وحواس کھو دیئے تھے۔ اسی عالم میں اس نے دیکھا کہ ''اللہ میاں میرے روبرو ایک اسٹول پر آ بیٹھے ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے وہ کام میں منہمک تھے محنت کے پسینے سے شرابور تھے۔ وہ تعمیر میں منہمک تھے پاکستان کی تعمیر۔'' مفتی کی یہ تیسری جہت دماغ کو نہیں دل کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیتی ہے اور ہم اس طرح پاکستان کو عالم اسلام کے لیے دل کا منصب حاصل کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔

تیسری جہت کی اہمیت کے سبب مفتی کو بابوں کا چسکا پڑ گیا یہ عجیب بات ہے مفتی نے بابوں کو تلاش نہیں کیا بلکہ بابے مفتی کو تلاش کرتے کرتے اس تک پہنچ جاتے تھے حالانکہ تلاش مفتی کی گھٹی میں پڑی تھی بچپن ہی سے اسے والد کی محبت کی تلاش رہی، ماں کے لیے سکون کی تلاش رہی، گھریلو امن وسلامتی کی تلاش رہی، اپنے لیے مسرت بھرے ماحول کی تلاش رہی۔ پہلے تو تلاش نے اسے بے چین رکھا پھر اس میں لذت پیدا ہو گئی۔ جب قلم اٹھایا تو آپا میں تلاش کی خلش کو اس طرح سمو دیا کہ اس کے قارئین بھی اسی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ مفتی کے یہاں تلاش اور تسکین کے مقابلے میں تخلیق کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔ نا آسودگی کی ایک لہر قارئین کو اس کے ساتھ ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ چپکے چپکے غیر محسوس طور پر۔ وہ شعور کے سراب میں خود بھی بھٹکتا ہے اور اپنے قاری کو بھی اسی راہ پر لے جاتا ہے۔ جسے عام حقیقت سمجھا وہ اسے غیر مانوس لگی اس نے اعتراف کیا کہ ''یہ حقیقت اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں بیٹھ سکی اور آج تک میں افسانے کے لیے انوکھے موضوع ڈھونڈ رہا ہوں۔'' مفتی نے اپنی ادبی زندگی سے پہلے سنگ میل ''آپا'' کو خلوص سے خالی قرار دیا ہے اور پکار اٹھا لوگوں کی توجہ ''آپا'' کی طرف کر کے میں خود ''ساجو باجی'' کا پتا پوچھتا پھرا۔ کسی ساجو باجی کا پتہ بتایئے للہ کسی ساجو باجی کا پتہ بتایئے اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا ''آپا'' خوب ہے لیکن کسی ''ساجو باجی'' کا پتہ بتایئے۔

مفتی کے اپنے روزمرہ میں تلاش کا عمل اس کے لاشعور کا جزو تھا تو رفتہ رفتہ اس کے شعور پر عشقِ پیچاں کی طرح لپٹ کر ایک طفیلی عضو بن گیا۔ چھڈ یار کے ایک رُکن بلکہ رُکنِ رکین اشفاق احمد کا اس کے بارے میں خیال ہے کہ لوگ پہلے آسمان پر عید کا چاند تلاش کرتے ہیں قدموں کا نشان دیکھ کر چور کا کھوج لگاتے ہیں کلائی ہاتھ میں لے کر معدے کے اندر حدت تلاش کرتے ہیں کھنڈرات دیکھ کر پرانے لوگوں کا چلن ڈھونڈتے ہیں شادی کے لیے اچھی نسل تلاش کرتے ہیں خوش قسمتی کے لیے اچھا جسم تلاش کرتے ہیں، مفتی کی تلاش میں تشویش بھی ہے اور تشویق بھی جو اس ماں کی یاد دلاتی ہے جو گمشدہ بچے کی تلاش کرتے کرتے انجانے راستوں اور کونے کھدرے تک پہنچ جاتی ہے۔ مفتی کے ندیمِ قدیم مسعود قریشی نے اس کی اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

سرحدِ عمر تک لے آئی تلاشِ جاناں
اب بھی کہتے ہیں کہ گھر اس کا ذرا آگے ہے

مفتی تلاش میں اس قدر مصروف اور سرگرداں رہتا ہے کہ اسے یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ خود کو تلاش کر رہا ہے خودی کو تلاش کر رہا ہے یا خدا کو۔ زندگی کے ہر دور میں وہ اللہ کا قائل رہا مفتی نے ایک مقام پر لکھا کہ "میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں اس کی عظمت اور بے نیازی اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور جمادات کے مطالعے سے پیدا ہوتا تھا۔ اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا میں اسے رب العالمین سمجھتا تھا۔ رب العالمین میں میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی سلطنت سیکولر تھی۔ میرے نزدیک اسلام ایک ضابطہ عمل تھا جو صرف بنی نوع انسان کے لیے باعثِ فلاح تھا جس کے لیے اللہ کو اپنے طرزِ عمل میں ردوبدل گوارا نہ تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔ مفتی کی مذہبی سوچ کا محور یہی خیال ہے لبیک میں بھی اس نے اسی تصور کے گرد واقعات، تاثرات اور امکانات کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اس کا پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ عمل کو پسند کرتا ہے اور عام طور پر مسلمان محض زبان سے اللہ اللہ کر کے اسے خوش کرنا چاہتے ہیں اسی لیے حج کے اختتام پر مفتی کی چشمِ تصور نے دیکھا کہ حرمِ کعبہ کے دروازے پر اللہ بیٹھا ہر ایک

حاجی سے کہتا ہے مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور وہ سر جھکا کر اپنا زادِ راہ اور مال و اسباب اٹھا کر بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں معبود تو اسی کالے کوٹھے میں ہی بستا ہے۔" مفتی کی آخری کتاب تلاش کا مرکزی خیال اور خلاصہ یہی ہے، جو منزل نہیں نشانِ منزل ہے۔ مفتی تلاش سے تھکتا نہیں کیونکہ اس میدان میں اس کی رہنمائی کے لیے اللہ کے آخری رسول سے عقیدت کی روشنی موجود ہے وہ رسولِ خدا کی محبت سے سرشار نظر آتا ہے، جس کے نام کی تشریح میں کتابیں تحریر کی گئی ہیں لیکن مفتی نے سرمستی کے عالم میں جو الفاظ سپرد فرمائے ہیں وہ قاری کو ایسی سرخوشی میں نہلا دیتے ہیں جس کی اسے تلاش و تمنا تھی۔

"میں نے زندگی میں ایک نام دیکھا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل جامع اور پرفیکٹ ہے صوتی، معنوی، نفسیاتی ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع ہے اس میں سُر ہے، لے ہے، نغمگی ہے، معنوی لحاظ سے مثبت اثرات سے بھرپور ہے، ماڈرن ناموں کی طرح مختصر ہے، جامع ہے، پیارا ہے، مفہوم کے اعتبار سے قابل احترام ہے، قابل ستائش ہے اور وہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، سبحان اللہ کیا نام ہے!"

مفتی کی تلاش کے ان گنت پہلو ہیں کبھی وہ اندر جھانکتا ہے، کبھی باہر تانکا جھانکی کرتا ہے کبھی نفسیات کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے، کبھی فلسفے کی راہوں میں بھٹکتا ہے کبھی صوفیوں کی جوتیاں سیدھی کرتا ہے اور کبھی عالموں کے استدلال کی بھول بھلیوں کی سیر کرتا ہے۔ اسی سیر میں وہ اپنی تحریروں میں اپنے بارے میں اعترافات اور اطلاعات کی چنگاریاں اڑاتا ہے، ان چنگاریوں میں ہم مفتی کو تلاش کریں دیکھیں کیا ہاتھ آتا ہے۔

"سکول میں مَیں نالائق طالب علم تھا۔ رعائتی پاس ہو جاتا کیونکہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا۔ کالج میں دل نہ لگا کیونکہ شدید احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ میں طبعاً ڈرپوک اور نروس آدمی ہوں۔"

"میں ایک کمزور اور نروس آدمی ہوں کمزور اور نروس آدمی کو غصہ یوں جھنجھوڑتا رہتا ہے جیسے بچے بیری کے درخت کو جھنجھوڑتے ہیں۔"

”کچہری کے نام سے ہی خائف رہتا ہوں۔۔۔ وہاں جا کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں ایک ان پڑھ نیچ آدمی ہوں جو برہمنوں کے دیس میں اکلوتا ہے۔۔۔ جتنی تذلیل میری کچہریوں میں ہوئی اور کہیں نہیں۔“

”مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو دوسروں کے جھگڑوں میں ملوث ہونے سے ہچکچاتے ہیں۔“

”ادب میں دوستووسکی میرا رہبر تھا۔ اس کی تحریریں میرے بند بند میں رچی ہوئی تھیں۔“

”پتا نہیں مجھے عالمانہ باتوں سے کیوں چڑ تھی۔ کوئی عالمانہ بات کرے تو یوں لگتا ہے جیسے خالی زبان کرتب دکھا رہی ہو اور بات کا دل سے کوئی تعلق نہ ہو۔“

”میں نے اپنا مطالعہ نفسیات سے شروع کیا تھا پھر جنس میں جا پہنچا اور وہاں سے چلتے چلتے پیرا سائیکالوجی میں جا نکلا۔“

”میں طبعاً ایک کمزور آدمی ہوں اور محفل کے رنگ سے ہٹ کر بات کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔“

”مجھے خوبصورت لڑکوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں پانی بہت پیتا ہوں اور بار بار پیتا ہوں۔“

”میں ایک منہ زبانی مسلمان ہوں میری زندگی عمل سے یکسر خالی ہے۔“

”میرا باطن شکوک و شبہات سے اٹا پڑا ہے۔ اور باتوں سے چند ایک روز متاثر ہوتا ہوں پھر منکر ہو جاتا ہوں۔“

”میں ہومیوپیتھی کا ایک پروانہ ہوں اور میری زندگی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگ ہومیوپیتھی کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے مستفید ہوں۔“

”میں سیکولر تھا چاہے دانشور تھا چاہے نام کا تھا بہرصورت مسلمان تھا۔“

”میں نے لاہور کے ریفیوجی کیمپ میں زندہ لاشوں کے ڈھیر دیکھے۔۔۔ وہاں کے خونی مناظر دیکھ کر میری روح میں ایک دراڑ پڑ گئی جس سے ساری

کی ساری دانشوری چو گئی سیکولر ازم کا پھوڑا پھوٹ گیا اور میں مسلمان ہو گیا صرف یہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا ہوں مجھے شدت سے احساس ہو گیا کہ پاکستان میرے لیے واحد پناہ گاہ ہے۔"

"قیام پاکستان کے بعد اگرچہ میرا زاویہء نظر بدل گیا۔۔۔ پھر بھی اسلام سے کورا ہی رہا۔"

"میں معجزات کو مانتا ہوں، لیکن ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں کشف کو اہمیت نہیں دیتا۔"

"پہلی ہی کوشش پر میں جانا پہچانا ادیب بن گیا۔۔۔ حالانکہ اردو زبان سے قطعی ناواقف تھا اور ادیب بننے کی تو آرزو تھی نہ امید۔"

"میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی پیشگی طور پر مل گئی۔"

"نہ تو میں محقق ہوں اور نہ نقاد الحمد للہ کہ نقاد نہیں ہوں۔ الحمد للہ کہ عالم نہیں ہوں۔ نکتہ داں، نکتہ چیں نہیں ہوں۔ قلم قبیلے کا ایک عام تخلیق کار ہوں۔"

"میں ایک قلم مزدور ہوں۔ مجھے بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے کچھ ہانڈی روٹی کے لیے کچھ ذہنی عیاشی کے لیے۔"

"میں خود کو ایک سکہ بند دانشور سمجھتا ہوں، میرا ایمان ہے کہ میں ایک انجیکٹو مفکر ہوں۔"

"میں ایک ادیب ہوں میں نے کبھی کوئی ادبی پرچہ نہیں خریدا۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ ادبی پرچوں کے مدیر مجھے اپنا پرچہ مفت بھیجیں گے اور وہ بھیجتے ہیں۔"

"مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ سب باتیں کہہ ڈالوں، جو میرے دل کی گہرائیوں میں مچلتی ہیں لیکن جنہیں میں کہہ نہیں پایا۔ جو جذبات سے نہیں بلکہ زندگی کے اس جھونکے سے تعلق رکھتی ہیں جو دور دراز کے کسی نامعلوم مقام

سے آتا ہے اور ہم انسانوں کی زندگی کو عظیم خوف سے بھر دیتا ہے اور غیر انسانی مخلوق کی بے انتہا طاقت کی خبر دیتا ہے۔"

ہمیں اور آپ کو جو مفتی کے قدر شناس ہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا مفتی نے وہ سب باتیں کہہ ڈالیں جو اس کے دل کی گہرائیوں میں مچلتی تھیں آیئے دل کی گہرائیوں میں اتریں کیوں کہ لسان الغیب حافظ شیرازی نے تلاش کرنے والوں کو مشورہ دیا ہے کہ:

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

-☆-

احسان اکبر

چھڈ یار

ڈرامہ ہو یا مضمون سب ریڈیو کا حصہ تھا اور ریڈیو تو روز کا فیچر تھا، مگر خالص ادبی اصناف میں بھی ممتاز مفتی کی مصروفیت مسلسل تھی۔ اُن کے پاس جو اسلوب ہے پھر اس اسلوب پر جس قدر وسیع تنوع یہاں ملتا ہے وہ عام قلم کار کے بس کی بات نہیں۔ خاکہ، سفرنامہ، رپورتاژ، ناول، خودنوشت، انشائیہ، سٹیج اور ٹی وی ڈرامہ یہ سب وہ خارجی آفاق ہیں جن سے ممتاز مفتی کے تخلیقی پھیلاؤ کا ہم احاطہ کرتے ہیں۔ جتنے کردار اکیلا "علی پور کا ایلی" سامنے لے کر آتا ہے اتنے کردار کسی اور ناول میں ہمارے سامنے کبھی نہیں آئے۔ "ایلی اور الکھ نگری" الگ ایک نصف صدی کا قصہ ہے مفتی صاحب کے رپورتاژ اپنا جداگانہ طلسمات بناتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ بھی حقائق پر تبصروں سے لبریز ہوتے ہیں کیونکہ حقیقی زندگی کا سفر بھی سناتے ہیں۔ خاکے میں یہ کمال کہ خاکہ نگار خود آرزو کرتے کہ ممتاز مفتی ان کا خاکہ لکھیں۔ افسانے میں مفتی اپنی جگہ صاحب اسلوب۔ ایسا جھنجھنا بجاتے ہیں کہ قاری بچے کی طرح لپکے۔ رہا "لبیک" تو اس کا اسلوب سادہ لفظوں میں عہد آفریں اسلوب ہے۔ انشائیہ نگاری میں وہ سب سے پرانے قلم کار تھے جن کے لکھے ہوئے مضامین Personal Essay کے معیار پر پورے اترتے ہیں مگر ہم آپ نے ممتاز مفتی کو کبھی دُون کی لیتے نہیں دیکھا کہ "صاحب! ہماری اس حیثیت کا احترام کیا جائے۔"

وجہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک کارکن، کارندے اور "کامے" تھے، ادبی تخلیق روز کا کام تھا۔ یہ اصناف اُن کی تھیں اور اُن سبھی اصناف میں وہ کسی نہ کسی حوالے سے نمایاں بلکہ بے حد نمایاں رہے یہی ان کی تسکین کے لیے کیا کم تھا؟ تاہم افسانہ ان کی پہلی پسند بھی تھا اور

پہلی تخلیق بھی۔ان کے ہاں دیگر اصناف میں ان کا مسلک بھی جھلک سکتا ہے اور ملک بھی مگر ان کا افسانہ اپنی جدا سی اڑان رکھتا ہے۔جنس وہ قاتل قلوپطرہ ہے مفتی صاحب جس پر سارا افسانہ نچھاور کر دیں۔افسانے کو جنس کی تاثیر سے کیسے چمکایا ہے یہ انہی کا ہنر ہے ملاحظہ کیجیے:

سمرت ہاتھ جوڑ کر بولی ''پریم تو ہے مہاراج، پرنتو جھولن نہیں۔''

''جھول جزیرے میں جھولن نہیں؟'' ارج مہاراج نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں مہاراج'' سمرت بولی ''پریم چکر سمان چلتا ہے جھولن سمان نہیں۔''

''جھولن سمان کیوں نہیں چلے ہے؟'' کیتو نے پوچھا۔

''مہاراج''! سمرت نے کہا ''جھولن سمان تو تبھی چل سکے ہے جب بڑھے، رُکے، بڑھے اور پھر سے بڑھے، جیسے لہر چلے ہے، مہاراج۔''

''سچ کہتی ہے'' چندر بولے، جو چکر سمان چلتا ہی جاوے ہے وہ کشٹ بن جاوے ہے جو رُک رُک کر لہر سمان چلے، سو آنند۔''

''مہاراج'' سمرت نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''اس پریم چکر نے میری سدھ بدھ مار دی ہے اور مہارج جب سدھ بدھ ہی نہ ہو تو آنند کیسا؟''

''سچ ہے'' ارج مہاراج بولے ''تو تو'' کہنے والے کو جب ''مَیں'' کی سدھ نہ رہے تو پھر جان لو کہ ''نہ تو'' رہا ''نہ میں'' رہی۔''

''تو نہیں بولتا'' سانورد؟ کیتو نے پوچھا۔

''یہ کیوں بولے گا مہاراج'' سمرت بولی۔ ''یہ تو میرا ''تو'' ہے اور اپنے کارن نرا ''میں'' ہی ''میں'' ہے اور مہاراج جو ''میں'' ہی ''میں'' ہوا سے پریم سے واسطہ؟'' ـــــ

''جا تیری اکشا پوری ہوگی۔ پریم چکر پریم جھولن میں بدل جائے گا جب پریم ہلارے اتنے بڑھ جائیں گے کہ دم گھٹے گا تو بھونچال آجائے گا۔ لاوا بہہ نکلے گا اور تو شانت ہو جائے گی'' ـــــ ارج مہاراج نے تالی بجائی ارداور رت

ہاتھ باندھے آ کھڑے ہوئے۔ یہ تمہارے بردے ہیں سمرت! رت تیری باندی ہے سانورد! ارد تیرا بردا ہے۔ جب پریم کشٹ بن جائے تو ارداور رت آ جایا کریں گے۔ یہ پریم یدھ ناچیں گے پھر کشٹ آنند میں بدل جائے گا۔"

پر ایک بات کا دھیان رکھنا۔۔۔ ان بردوں۔۔۔ کا اپمان نہ کرنا۔۔۔ ان کو لوبھ کے لیے برتو گے تو ان کا اپمان ہوگا۔ ایسا ہوا تو ارد میں اچھل نہ رہے گی اس کا سر نیچا ہو گیا تو پریم جھولن ٹوٹ جائے گا اور لوبھ چکر چل پڑے گا۔۔۔"

نیویارک کی نیوڈ کلب میں ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔۔۔ تماشائیوں کے جسم کے جسم لٹے پٹے تھے، جذبہء محبت شہوت کے گاڑھے ملبے کی دلدل میں بدل چکا تھا آخری سین ارداور رت کا ناچ تھا سٹیج پر اندھی رات انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہی تھی۔۔۔ ارد کی چنگھاڑ سنائی دی پھر کوڑوں کی آوازیں"۔۔۔ دو چار۔۔۔ سات" اور آخر گونگا ارد چیختا چلاتا سٹیج پر آ کھڑا ہوا اس کے آبنوسی جسم پر کوڑوں کی شنگرفی دھاریں پڑی ہوئی تھیں جن سے خون رس رہا تھا ارد نے رت کی طرف دیکھا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"تڑاخ" وِنگ سے ایک ہنٹر لہرایا۔

ارد درد سے بلبلا کر اٹھا ایک جست بھری لیکن اس میں اُچھل پیدا نہ ہو سکی اور وہ منہ کے بل گر گیا تماشائیوں کی غیض وغضب بھری آوازیں بلند ہوئیں۔۔۔ ہم نے کوڑے لگائے تھے سر!" "کوڑے بجلی کے" رنگ ماسٹر نے جواب دیا۔ منیجر نے جواب دیا" اُونہوں" اب کوڑے کام نہیں آئیں گے۔ ڈاکٹر کہاں ہے اسے بلاؤ بولو ڈبل انجکشن دے دے۔۔۔ اپ مین اپ۔"

وہ بولا" دی شومسٹ گو آن۔"

"ممتاز مفتی کی ۳۵ء کی لکھی ہوئی ذاتی ڈائری کے مطابق:

"میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے میں خدا سے ڈرتا ہوں اور اسی لیے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔۔۔ عورت سے ڈرتا ہوں اس لیے کہ اس کی جانب کھنچا جاتا ہوں۔۔۔

میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔۔۔میری طبیعت
میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے وہ جھجک اور کمتری ہے۔"

ان حوالوں سے بنی شخصیت اگر یونگ، فرائڈ اور ایڈگر میں دلچسپی نہ لیتی تو حیرت ہوتی۔ مسعود قریشی کے خیال میں:

"مفتی لاشعور کا دیوانہ ہے۔۔۔ کم از کم شعور کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے خیال میں بات کا اصل مطلب ظاہر الفاظ سے ہٹ کر ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ باقی لوگ بھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ کہی سے زیادہ ان کہی پر توجہ دیتا ہے۔۔۔ وہ غور اس بات پر نہیں کرے گا جو آپ لفظوں کے قالب میں اس تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس کی توجہ اس حصہ پر ہو گی جو آپ حذف کر رہے ہیں۔"

مسعود قریشی کہتے ہیں کہ ان کی بہترین تخلیق "آپا" (جو سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے) بھی ایسے ہی حوالے رکھتی ہے۔ بھائی جان باتیں کرتے ہیں "بدو" سے مگر مخاطب "آپا" ہوتی ہے یوں کیرم کی بازی لگتی ہے جبکہ حقیقت میں محبت کی بازی لگ چکی ہوتی ہے بطور اسلوب یہ مفتی صاحب کا خوبصورت انداز بھی ہے۔ احمد بشیر نے اس موضوع میں زیادہ دلچسپی لی۔

مفتی صاحب جنسیات کے غوطہ خور ہیں تو نفسیات کے تیراک بھی ہیں ان جیسا شخصیت کو کون سمجھے گا ان کے ناقد جب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مفتی موضوع کو اپنی ہی عینک سے دیکھتے ہیں تو جواباً وہ کہتے ہیں:

"میں خدا نہیں بندہ ہوں، میں صرف وہ کچھ دیکھتا ہوں اور لکھتا ہوں جو مجھے دکھتا ہے۔ میں نے کبھی حتمی سچائی کو پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا میں نے ہمیشہ "اپنا سچ" پیش کرنے کی کوشش کی ہے اپنے سچ میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔۔۔ عام نارمل فرد کی شخصیت مٹی کے مترادف ہوتی ہے لیکن تخلیقی فرد کی شخصیت سیال ہوتی ہے۔ اس میں حسیات کی لہریں چلتی ہیں۔ مدوجزر ہوتی

ہے۔۔۔میں اردو ادب کے بندھے ٹکے اصولوں کا پابند نہیں ہوں میں تخلیق کار ہوں میں اصولوں پر چلتا نہیں اصول بناتا ہوں۔"

ایک اور بار یوں کہا:

"پرانے قلم کار بڑے سیانے تھے، وہ شخصیت کی بھول بھلیوں میں قدم نہیں رکھتے تھے۔اس پر زم کی ہفت رنگی کی بات نہیں کرتے تھے بلکہ باہر کھڑے ہو کر جائزہ لیتے تھے جبھی انہوں نے شخصیت کو خاکہ نگاری کا نام دے رکھا تھا کہ قد کیسا ہے جسم بھرا بھرا ہے یا سکڑا، قلم کونسی جیب میں رکھتے ہیں، ڈیسک پر بیٹھ کر لکھتے ہیں یا میز پر۔"

مفتی صاحب خاکہ نگاری میں آدمی کے خارج و داخل کو دیکھنے کی سعی کرنا چاہتے ہیں۔عورت کی ذات کو جیسا انہوں نے سمجھا وہ انہی کا حصہ تھا کہتے ہیں:

"ناموافق حالات کے تحت مرد بجھ جاتا ہے، عورت نہیں بجھتی، بظاہر راکھ بن جاتی ہے لیکن موافق ہوا کا جھونکا آئے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور نیچے دبا ہوا انگارہ باہر نکل آتا ہے۔"

"ممتاز مفتی نے اپنے گردوپیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دورُخی کو شدت سے محسوس کیا وہ اس بات کو جان کر حیران ہوا کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں۔۔۔ ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا کہ وہ ان کہی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں۔" (سورما: احمد بشیر)

"یہ بات مفتی میں کمال کی ہے بلکہ اب تو اس کی فطرت کا جزو بن چکی ہے کہ بات ہو یا افسانہ، روایت سے بغاوت ضرور کرے گا۔ایسی بات کہنے میں تو اسے خاص لطف آتا ہے جو غیر متوقع ہو۔" (اونہیں جی: مسعود قریشی)

شہاب صاحب پر لکھتے ہوئے مفتی صاحب نے ادیب کی شخصیت کی نقاب کشائی خود کی:

"ادیب کی شخصیت فقر خانے کے مصداق ہوتی ہے جہاں معذور شہنشاہ بستے ہیں۔ جہاں گونگے بولتے ہیں، اندھے دیکھتے ہیں، لنگڑے دو پاؤں پر چلتے ہیں، اپنے دکھ کو بھلانے اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے عمل میں لائے جاتے ہیں۔۔۔ قدرت میں نمائش تھی نہ شدت، نہ تضاد۔۔۔ اس کی تحریر میں چونکا دینے والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے جملوں میں توجہ طلبی کا عنصر نہ تھا۔"

(قدرت اللہ شہاب: ممتاز مفتی)

یہیں مفتی صاحب کا قلم تجزیاتی مطالعے میں ایک بے مثال جملہ رقم کرتا ہے:

"اوصاف ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتے کمزوریاں لاتی ہیں۔"

مفتی صاحب پاکستانی افسروں کے عین برعکس مزاج رکھتے ہیں لیکن ان افسروں کی طرح اپنی اردو دانی کی کمزوری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اس کمزور اردو کے باوجود حال یہ ہے کہ بے حد لکھا۔ بے شمار اصناف میں لکھا اور بے قیاس کامیابیاں پائیں۔

"کہتا ہے مجھے زبان پر قدرت نہیں اور یہ کہنے کے باوجود اظہار کے لطیف اور نازک پہلو پیش کرتا ہے اس کا انداز اس قدر منفرد ہے کہ کسی افسانے سے بھی ایک ٹکڑا اٹھا کر پڑھ دیجیے یقینی طور پر یہ کہا جا سکے گا کہ یہ مفتی کا ہے۔ اردو کے شاعروں اور مزاح نگاروں میں تو چند باکمالوں کو اسلوب کی یہ انفرادیت حاصل ہے لیکن افسانہ نگاروں میں مفتی کے سوا کسی کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔"

(اونہیں جی: مسعود قریشی)

ممتاز مفتی کا یہ منفرد اسلوب دھماکوں سے عبارت ہے۔ پروین عاطف کہتی ہیں:

"لوگ بے چارے تو کب سے توبۃ النصوح، منشی پریم چند اور راشد الخیری بغلوں میں دابے مزے مزے زندگی کاٹ رہے تھے۔ اردو ادب بیٹیوں کے جہیزوں کی زینت تھا، باغی کو یہ بات کب پسند تھی۔ اس نے رنگ رنگیلی لہڑی پر مسالے دار چاٹ لگائی اور چوک میں کھڑے ہو کر ہانکے دینے شروع کر

دیئے۔''(پائیڈ پائپر: پروین عاطف)

مفتی صاحب کو بغاوت بھی آتی تھی، چونکانا بھی آتا تھا، غیر متوقع آغاز، توجہ طلب اسلوب، لذیذ لہجہ پھر انسان کی تہ در تہ نفسیات، شخصیات کا دوسرا انگ، گلیشیئر کا دبا ہوا پہلو، ''ان کہی'' اور چپ، نفسیاتی مطالعے کے بڑے اہم شخصیت پیا ہیں۔

سجیسٹونیس Suggestiveness جسے سید عابد علی عابد نے خیال افروزی کہا وہ شے مفتی صاحب کے ہاں کہے ہوئے لفظ سے ہمیشہ ایک قدم آگے بڑھ کر ابلاغ کرتی رہی۔ ''آپا'' سے ''اسمارائیں تک، ''علی پور'' سے ''الکھ نگری'' تک اسرار تھا جوان نسوانی جسم کا، عنفوانِ شباب کا۔۔۔ایک پورا طلسم۔

خود اپنے آپ پر لکھا تو خود کو ''چھوٹا'' کہہ کر پکارا۔انہیں ہر عورت سے ہر لحاظ کے بغیر عشق ہے خصوصاً سفید رنگ پر عاشق ہیں پہلی محبوبہ سوتیلی ماں تھیں۔مفتی فطرتاً خواب خیال کی دنیا کا فرد ہے، تنہائی پسند شرمیلے، احساس کمتری کی نشانی، عورت کے تصور تک سے انہیں محبت ہے مگر دراصل محبت کرنے کے عمل سے محبت ہے شاید محبوبہ سے نہیں۔

محبوبہ عجیب تر ہے عمر رسیدہ مٹیار جو ہر جائی ہو، بے کردار بلکہ بد کردار ہو تو کیا کہنے، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ محبوبہ میں مامتا کا ہونا بھی ضروری ہے۔''ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ بے وفائی کی دھونس'' غرض ''طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے'' جو تخت پر بٹھا کر مورچھل بھی کرے، پھر لات مار کر گرا بھی دے اور آخر کار زندگی ہی سے نکل جائے۔ مگر وہ آفتِ دلِ عاشقاں امرتا پریتم صرف اس لیے پسند کر لی تھی کہ وہ ایک زمانے کی محبوبہ تھی۔

۱۹۳۵ء کے قیام ملتان کے زمانے میں ممتاز مفتی نے ڈائری میں لکھا:

''مراذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے میں عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔'' مگر بعد میں تو قومی حوالے ہی انہیں شہاب صاحب تک لے گئے انہی حوالوں نے ''لبیک'' لکھوادی۔

ذرا سی بات مفتی صاحب کی زبان دانی پر ہو جائے۔ ان کی اردو پر دیسی لونڈیا نہیں لگتی۔ان کی تحریر انہی پر گئی ہے۔ان کی زبان قطعی طور پر ذاتی ہوتی ہے:

”گھر میں سات جی تھے۔ لیکن روٹی کا فکر صرف مودی پر طاری رہتا“

”یہ پاگل پن میں ان کے گھر میں لایا تھا“

”سوچوں کا مارا ہوا دانا پر دانا“

غرض غلط زبان کا لکھنا ان کے دائیں ہاتھ کا کام تھا لیکن غلط پر اتنا اصرار کرنا کہ پروین عاطف بھی تحریر میں ویسا ہی کرنے لگیں، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا وہی بابا یاں میر حسن نے جس کے ہنر کو یوں بیان کیا تھا کہ:

گئی باتوں کی آسماں تک گمک

ایسا اتنے اصرار سے لکھا کہ خود ابدال بیلا سوڈے کی شوں شوں، لکھنے لگ گیا، تب کہیں آرام کیا۔ ہم بائیں طبلے کی بات کر رہے تھے، مفتی صاحب طبلے ہارمونیم کے ہنر میں بھی بند نہیں تھے، میوزک سکھایا نہ سیکھا نغمہ اور الاپ ساز اور آواز سرتیوں، سمرتیوں، مرکیوں اور تھرکیوں سمیت جانتے تھے تبھی وہ اس طرح کی بات کہہ سکے کہ:

”عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ گانے کو گلے سے تعلق ہے یہ خیال درست نہیں بنیادی طور پر گانے کو کان سے تعلق ہے۔۔۔ کچھ لوگوں میں سنی ہوئی چیز کو یادداشت میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے ایسے لوگوں میں گائیک بننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔“ (بیراگی)

”تال جسم پر اثر کرتی ہے سُر رُوح پر۔“

”موسیقی سے شدت کے ساتھ متاثر ضرور ہوتا ہوں۔“

مفتی صاحب کے ہاں تاثر کی تخلیق دو مختلف اور متضاد صورتیں دیکھئے کیا وہ الگ الگ شبیہیں نہیں بن گئیں؟ ملاحظہ کیجیے:

”اس روز میں نے طفیل کی دھن اور بولوں میں بلا کی ہم آہنگی محسوس کی اس ہم آہنگی نے میرے اندر ایک کیفیت پیدا کر دی یوں جیسے مٹی کا باوا کسی کے دوار پر کھڑا ہاڑے کر رہا ہو۔ طفیل کے اندر کا حبشی گا رہا تھا میں اکیلے میں سُن رہا تھا میرے اندر کا انسان میرے سامنے آ بیٹھا تھا۔“ (بیراگی)

''لگتا ہے جیسے دُکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو لیکن اس کی آنکھ میں ایک ایسی نگاہ بھی ہے جو چلتی آندھی کو باندھ سکتی ہے دریا کا رُخ موڑ سکتی ہے۔۔۔ پھول پر شبنم کے قطرے دیکھ کر کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ دُکھ ایک سنگار بھی ہے ایک انوکھا مگر زود اثر کاسمیٹک۔'' (شہزادی)

نثر نگار ممتاز مفتی کی کچھ شاعروں کے حوالے سے شخصی تصویر کشی ملاحظہ کیجیے:

''مزاحیہ شاعروں کے راستے میں ایک سخت مقام آجاتا ہے۔ بہت جلد انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں قاری اور سامع میں مزاح کی لطافت کا احساس بہت کم ہے لیکن طنز پر واہ واہ ہوتی ہے لہٰذا وہ فن کو چھوڑ کر واہ واہ کی جانب چل پڑتے ہیں۔'' (ست رنگا)

''وہ کیفیت جسے ''ہیپی نیس'' کہا جاتا ہے صرف ''میڈیا کر'' کو نصیب ہے لگتا ہے قدرت نے شعرا کو سکھی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ وہ جو زندگی کی انڈر بیٹ کو سننے کی حس سے نوازے جاتے ہیں، انہیں ذاتی زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔'' (شہزادی)

''وہ تو شاعر اور عالم کی مداح تھی لیکن شادی ادیب سے نہیں ہوتی بندے سے ہوتی ہے ادیب اور ہوتا ہے بندہ اور۔'' (کومل)

اب اس سبب کے ہوتے ہوئے کون ممتاز مفتی کا انکار کرے؟ مگر نہیں ''چھوٹا'' لکھ کر ممتاز مفتی نے خود ممتاز مفتی کا انکار کیا۔ احمد بشیر، مسعود قریشی، پروین عاطف سب ''مفتیات'' میں اسی راہ چلے۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ سب نے عام نظر سے ہی دیکھا۔ یہ عام ہونا ہی مفتی صاحب کا خواب تھا۔ آج کا عہد امریکہ، فوج، خواص اور کارکا عہد ہے وہ زمانہ عوام الناس کی مفلوک الحالی اور ادباء کی بے پروبالی کے باوجود عوام اور ادب کی اہمیت اور ادب کی عوام دوستی کا زمانہ تھا۔ مختار صدیقی کو یہ سکھانے والے نکتہ ور کہ:

نکتہ وروں نے ہم کو سکھایا خاص بنو اور عام رہو
محفل محفل صحبت رکھو، دنیا میں گمنام رہو

افسوس ہمارے زمانے تک نہ پہنچے سو ہم لوگ خواص اور عوام دونوں کی عمدہ صفات سے آشنا نہ ہو سکے۔ مفتی صاحب نے خصوصی ملبوس کبھی نہ پہنا، اونچے ہو کر کبھی نہیں بیٹھے، بولے تو عوام کی زبان میں، لکھا تو سادگی سے آسان اور چھوٹے جملوں میں۔ قوافی یا ہم صوت لفظیات کو جھوٹوں بھی منہ نہ لگایا۔ شاعروں کو نثر نگاروں پر فوقیت دی۔ شاعر کی قدر کی مگر نثر کے عیوب چھپانے کے لیے شعر کا سہارا کبھی نہ لیا۔ میر نے کہا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص، پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

پر ظالم نے عوام کا تو کبھی سلام بھی نہ لیا تھا۔ مفتی صاحب دفتر کے بڑے کے ہمراہ چلتے ہوئے بھی چپڑاسیوں، نائب قاصدوں اور ڈی آر سے علیک سلیک کرتے جاتے وہ جو کسی سے کہا تھا:

خیالِ خاطرِ احباب اور کیا کرتا؟

انہوں نے عموماً عامی لہجے میں بات کی مگر بسا اوقات معنی دور کا نکالا۔ گئے گزرے حسن کا طلب گار، تھوڑی سی توقعات والا قانع کردار آج ہمارے ارد گرد اور کون ہے۔

لیو ٹالسٹائی ان کے پسندیدہ مصنفوں میں تھا۔ نقاد کے بارے میں جو اس کا خیال تھا کہ تنقید نگار وہ مکھی ہے جو گھوڑے کو کام کرنے سے روکتی ہے۔ یہی نقطہءنگاہ مفتی صاحب کا رہا حد تو یہ ہے کہ وہ جمیل عالی صاحب جیسے ثقہ محقق کو تحقیق و تنقید سے تخلیق کی طرف لانے کی سعی کرتے رہے۔ وقار بن الٰہی جیسے تارک الحکایت کو جو تیس سال سے لکھنا چھوڑے ہوئے تھا مفتی صاحب دوبارہ افسانہ نگاری میں گھیر کر لے آئے۔

مفتی صاحب کی طرح ہمارے بہت سے تخلیق کار تنقید پر تخلیق کو ترجیح دیتے ہیں مگر جہاں اپنی ذات کا سوال آتا ہے یا اپنے مرتبہ کا تعین درپیش ہو، ان کے اندر کا خفتہ اور خفیہ تنقید نگار خود اپنا نام لیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہیں ادبی تفہیم کے راستے میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس بابت پورے سچے آدمی تھے تنقید کو ناپسند کیا تو انشائیہ ہو، افسانہ نگاری ہو، خاکہ نگاری ہو یا رپورتاژ کی دنیا، انہوں نے کسی حوالے سے اپنی بڑائی ثابت کرنے کی مجبوری سے تنقید کا ترازو نہیں پکڑا۔ وہ سارا وزن تخلیق اور مسلسل تخلیق

کے پلڑے میں ڈالتے رہے۔ ہر صنف میں اپنے مقام کا تعین آنے والے وقت کے سپرد کیے رکھا۔ افسانہ نگاری جیسا کہ بیان ہوا ان کی بنیادی شناخت رہا ہے اور فکشن سارے میں ''ان کہی'' ان کا وسیلہ اظہار۔ مسعود قریشی تو کہتے ہیں کہ عام گفتگو میں بھی کہنے والے نے جو بات کہنے سے روک لی ہو مفتی صاحب اس کو اصل گفتگو سمجھتے۔ آیئے ان کے کہنے اور لکھنے میں سے بعض ''ان کہی'' اور ''ان دیکھی'' صداقتوں کی تلاش کریں جن صداقتوں کا اظہار خود مفتی صاحب جیسے حقیقت نگار کے منصوبے کا بھی حصہ نہ تھا۔

یہاں سے ہمیں مفتی صاحب کے زمانے کا پاکستان اپنی حقیقی تصویر دکھا سکتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ عیسیٰ خیلوی کا کہنا کہ ''تینوں چک کے لے جانا میانوالی'' آیا واقعی اس معاشرے کا بھی کلچر بن چکا ہے یا نہیں۔ وہی معاشرہ جس میں ہم اور مفتی صاحب سانس لیتے رہے ہیں۔

> ''گٹ اسائڈ'' وہ چلاّئی نوجوان نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ نمانہ چیخی چلاّئی تو وہ بولا ''یہاں آپ کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا چُپ چاپ چائے بنایئے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے مقابل کی کرسی پر جا بیٹھا۔ نمانہ چُپ چاپ غصّے میں اُبلتی ہوئی چائے بنانے لگی۔۔۔ میں نے تو صرف یہ ریکویسٹ کی تھی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر ایک پیالہ چائے پی لیں۔ اس سے میرا کوئی مقصد نہ تھا۔ معمولی سی کرٹسی، تھینک یو' اس نے چائے کا پیالہ پکڑ کر کہا۔'' (مانا نمانہ)

ٹھیک اسی طرح کی فرمائش کرٹسی کی توقع غلام محمد کو اپنے زمانے کی اسمبلی سے تھی جسے اُسے بھر خواستہ و نخواستہ برخواست کرنا پڑا۔ اسی فرمائشی خوش خلقی کی توقع ہر زمانے کا چیف آف سٹاف اپنے وزیر اعظم سے رکھتا رہا۔ کرٹسی کی یہی توقع ہمارے مرد اداکار کے ادا کیے ہوئے جملوں سے بھی ظاہر ہوتی رہی ہے جب وہ ہمارے ٹی وی پر اپنی محبوبہ یا نکاح یافتہ محبوبہ سے ڈائیلاگ بول رہا ہوتا ہے۔ طاقت کا یہ کلچر ہمارے روزمرہ کا اتنا قدرتی حصہ ہے کہ مفتی صاحب

جیسے باریک بین کو بھی عجیب نہیں لگا۔ ان کا کردار کہتا ہے"۔۔۔ یہاں ہر لڑکی
خود کو ہر وقت لڑکی سمجھتی ہے، کبھی بھول بھی جایا کریں کہ آپ لڑکی ہیں۔۔۔
خدا حافظ۔" (مانا نمانہ)

یہاں کی لڑکی بھی لڑکی ہونا بھول کر دکھا سکتی ہے مگر کیا چھ سالہ لڑکی پر جنسی تشدد کرنے والا ہمارا مرد یہ بھولتا ہے کہ یہ ابھی بچہ ہے لڑکی نہیں بنی۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ:
"بھیڑیوں کے لیے ان کے غار اور بھٹ سب سلامت ہیں پر ابن آدم کی خاطر کہیں سر چھپانے کی صورت نہیں (ابھی سورج نہیں ڈوبا) آدمی کیا کرے! بیان کردہ منطق ہی کے تحت مقبوضہ کشمیر میں B-S-F والے جب خانہ تلاشی میں گھروں سے مردوں کو نکالتے ہیں تو کئی مرد مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں حالانکہ یہ جہاد اور لڑائی کا موقع نہیں ہوتا صرف عورتوں کی تلاشی لینے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاکستان میں بھی ڈاکو جب رات کو عورتوں سے کھانے پکوا کر کھانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں تو گھر کی چابیاں سپرد کر دینے والے مرد بھی عورتیں سپرد نہیں کرتے وہ بھی سوچتے ہیں کہ گھر لٹنے کے وقت بھی لڑکی لڑکی اور عورت عورت رہتی ہے۔ لڑکی کیا کرے!

"نمانہ گھر پہنچی تو یوں تنی ہوئی تھی جیسے سارنگی کے تار۔ تناؤ ذرا کم ہوتا تو لذت
کی ایک رو جسم میں دوڑ جاتی۔۔۔ ماں نے کہا بیٹی تیرے لیے ایک رشتہ آیا
ہے۔۔۔ تیری مرضی۔۔۔ یہ لڑکے کی تصویر ہے" تصویر کو دیکھ کر نمانہ چونکی
آنکھیں غصے میں اُبل آئیں۔" (مانا نمانہ)

افسانے ہی کا حصہ نیچے کا نوٹ ہے، جس میں انہوں نے پوچھا ہے کہ کردار و واقعات کی روشنی میں قاری بتائے کہ نمانہ نے رشتہ پسند کیا ہو گا یا کہ ٹھکرایا۔

جنس پر لکھنے والوں کے اپنے احوال و مقامات ہوں گے۔ مفتی صاحب نے لکھا اور بہت لکھا مگر منٹو کی طرح نہیں کہ پکڑائی دے دیں۔ مفتی صاحب کی نگاہ میں جنس نوجوان پڑھنے والوں اور والیوں میں مقبول تھی سو لکھا۔ خدا سے ڈر تھا سو خدا کے خلاف زبان و قلم کو حرکت دی۔ قوم کے حوالے سے "شدید" ہونا پسند ہی نہ کیا۔ قیامِ پاکستان تک تو ہندو مسلم

تخصیص کو بھی گناہ سمجھا۔ پاکستان بننے کے بعد جا کر پاکستانی ہوئے۔

حیرت ہوتی ہے کہ مولائے دوجہاں کے پاس حاضری اُن کے لیے کتنی آسان ہوگئی "لبیک" لکھنا کیسے ممکن ہو گیا پھر "لبیک" کی مقبولیت؟ یہ سب کسی تائید کے بغیر کیسے ممکن تھا؟ پھر یہ جو "بابے" انہیں نصیب رہے، عزیز ملک کی ہمراہی پھر قدرت اللہ شہاب کا سنگ! سبحان اللہ۔

میں نے مفتی صاحب کی وفات سے ٹھیک ایک سال پہلے ہونے والی ان کی خصوصی سالگرہ کی نشست میں مذکورہ حوالوں سے اپنے تحیر کا ذکر کیا اور سوچا کہ ان کے لیے یہ سارے مراحل کیسے آسان کر دیئے گئے۔ خود لکھنے کا عمل ان کے لیے کتنا آسان تھا کہ پنسل سے فل سکیپ پر لکھتے۔ غلط ہو جاتا تو ربر سے مٹا کر لکھتے چلے جاتے یوں پہلا پروف ہی فول پروف ہوتا۔ غلط زبان لکھی اور مکمل بے خوفی سے لکھتے رہے۔ عام بول چال ہی کی سطح کو مضمونوں، خاکوں میں سُرت لیتے۔ "صاحبو" کہا اور بات شروع۔ افسانہ خاص مفتیانہ آغاز رکھتا مگر یہ آغاز خصوصی ہوتے ہوئے بھی کبھی مشکل پسند یا محدود نہ بنا۔ خود سب کے بن کے رہے کسی کے لیے دوستی کو بھی محدود نہ کیا۔ احمد بشیر، پروین عاطف، مسعود قریشی، اشفاق احمد، عماد، عمر، بانو، شہاب تو ایک طرف کہ ان کے ساتھ عمروں کا سنگ تھا، میں، جلیل عالی، رشید امجد، ابدال بیلا، بلقیس محمود کسی کو یہ گماں نہیں رہا کہ اس کے ساتھ ان کا تعلق کم تر تھا۔

ہر اک کو یہ گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

ان کی زندگی تحریر و تخلیق سادگی، سہل الحصولی اور ہمہ دوستی تھی، یوں پوری زندگی بے فکری کی ایک ایسی سیدھ میں آ گئی تھی جسے "چھڈ یار" کے سوا اور کچھ کہنا شاید ناموزوں ہو۔

عنوان چننا تو اُن کا مسئلہ نہ بنا عنوان رکھتے ہوئے انہوں نے نام کا کبھی وہم ہی نہیں کیا۔ "اپمان" ہندی لفظ کے ساتھ UpMan انگریزی ملا دیا اور نام رکھ دیا۔ "مانا نمانہ" بھی کوئی نام بنتا ہے؟ نہ بنے ان کی بلا سے انہوں نے بنا دیا بلکہ "مانا نمانہ" دونوں کی املا نشانہ کے وزن پر ہی کر دی، کر لو جو کرنا ہے۔ سادگی اور بے پروائی کی اسی سیدھ میں ان کی پوری زندگی تھی۔

فنکشن میں مَیں نے یہ سب باتیں کہیں تو آنکھوں میں چمک آ گئی کہنے لگے یہ سب مجھے لکھ کے دے سکتا ہے؟ میں نے اقرار کیا تو دوبارہ وعدہ لیا بولے اتنا کچھ تو میرے بارے میں کبھی کسی نے نہیں کہا۔کوئی مانے گا؟ اتنا بڑا ادیب اور اتنا عجز!

☆

ہفت رنگ ادیب ممتاز مفتی

مفتی ممتاز حسین ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۲۹ء میں بی اے کی ڈگری لینے کے بعد سکول ماسٹر بنے۔ ان کا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا اور اس طرح وہ مفتی ممتاز حسین سے ممتاز مفتی بن گئے اور آج وہ پورے کے پورے ممتاز مفتی ہیں۔ ممتاز حسین تو بہت ہوتے ہیں، ممتاز مفتی کا تا امروز کوئی مدمقابل نہیں۔۔۔ وہ منفرد ہے، ہفت رنگ قوس قزح کی طرح، جس سے رنگینیاں بہتی اور پھیلتی دکھائی دیتی ہیں اور ان بہتے پھیلتے رنگوں میں ہیئت و نیرنگِ نظر اور اسلوب و انداز کی دنیا آباد ہے۔ اوکھے، اور عجیب و غریب کردار سرنہادہ اور برافگندہ نقاب کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقام پر ژاں پال سارتر کا وہ انٹرویو یاد آجاتا ہے جب اس نے کہا تھا مغربی و یورپی ادب میں مواد کی اور مشرقی میں فنی دستگاہ کی کمی ہے مگر ممتاز مفتی کی ادبی تخلیقات کے مطالعے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ ان کے ہاں مواد کی کمی ہے اور نہ ہی فنی دستگاہ کی۔ ان کے ہاں اظہارِ ذات اور اظہارِ فن کی مختلف روشن اور حسین صورتیں کہیں تخیل اور جذبے کی جادوگری کے سہارے کہیں رمز آفرینی کے تعلق و تعمق کے ساتھ کہیں ظاہر و باطن کے فطری و مافوق الفطری تضادات کے ساتھ کہیں عینیت اور حقیقت پسندی کے حوالے سے اور کہیں غیب و شہود Appearance & Reality کے مسلسل عمل اور ردعمل سے نم وضو حاصل کرتی ہوئی ظاہر ہوتی ہیں اور اس طرح کہ انسانی شخصیت اور نفسیات (Personality & Psychology) کے ان گنت گوشے ظاہر و فاش برملا دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

''انسانی شخصیت کے ان گنت پہلو ہیں لیکن سب سے ظالم پہلو اس کی پرکاری ہے۔ وہ رنگارنگ شیشوں کی بنی ہوئی قندیل نہیں جو ہر رنگ میں جلتی ہے بلکہ وہ ایک سادہ اور مدھم شعلہ ہے جو بظاہر ہر ایک رنگ میں جلتا ہے مگر اس ایک رنگ کے پردے میں ہفت رنگ چھپائے ہوئے ہے۔''

ممتاز مفتی نے اس رنگ سے ہفت رنگیت اُڑا لی ہے اور یہی ہفت رنگی ان کے تخلیق عمل کی وضع وتزئینی خصوصیت بن گئی ہے۔ ممتاز مفتی کے یہاں نہ تو نری رومانیت پسندی ہے اور نہ ہی اکتا دینے والی حقیقت یا عینیت پسندی بلکہ ان تینوں رجحانات کو جنس کی ہلکی یا گہری چاشنی دے کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کا منفرد انداز ہی نہیں بلکہ جدید افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں ان کی ادبی شخصیت کی پہچان بن گیا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنی ادبی شخصیت کو خشک فلسفے کی ''گھمن گھیریوں'' سے بچا کر انسانی نفسیات کے متنوع اور مختلف النوع عمل اور ردعمل کو اپنا موضوع بنایا ہے جو ان کے خیال میں فلسفے کی بے رنگی سے زیادہ خوش رنگ، پہلودار، دلچسپ اور دل پذیر ہے۔ ممتاز مفتی کی بیشتر تخلیقات اسی جنسی محور پر گردش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ''ضیا کے پاؤں'' ہوں کہ ''شرابی کا راز''، ''بیگانگی'' ہو یا ''سمے کا بندھن''، ''گڑیا گھر'' ہو یا ''تھرڈ ملن''، ''دومونہی'' ہو یا ''روغنی پتلے'' یا ''ہانٹڈ ہاؤس'' سب کے اندر یہی روح کارفرما ہے۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سگمنڈ فرائیڈ، ایڈلر اور یونگ کی نفسیات نے مفتی کو بہت متاثر کیا ہے۔ اتنا کہ بعض ناقدین اس کے انسانوں پر کیس ہسٹری کا الزام لگا دیتے ہیں۔ ایسا الزام سراسر زیادتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ممتاز مفتی نے اردو فکشن کی یکسانیت کو دور کرنے اور نئی راہیں نکالنے کے لیے فلسفے کی بہ نسبت نفسیات کے ماہر مشاہیر سے استفادہ کیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے نہ ان کی نگارشات کی ادبی حیثیت میں کمی ہونے پائی ہے نہ دلچسپی کا عنصر کم ہوا ہے، نہ کوئی بوجھل پن محسوس ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کا ثقل پیدا ہونے پایا ہے۔۔۔ یہ اس لیے کہ وہ فلسفے کی بہ نسبت نفسیات کے تنوع اور ہمہ گیری کے زیادہ قریب رہے ہیں۔ چنانچہ ان پر کانٹ، نیٹشے، برگساں اور برٹرینڈ رسل کی بہ نسبت

فرائیڈ، ایڈلر اور یونگ کا رنگ و آہنگ زیادہ نمایاں ہے اور فلسفے کی چاشنی اتنی گہری نہیں ہونے پائی ہے کہ تھکا دینے والی بے رنگی اور یکسانیت پیدا کر سکے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ممتاز مفتی کے پاؤں بڑی مضبوطی کے ساتھ زمین پر جمے رہتے ہیں۔ وہ زمین کی صدرنگ انجمن آرائی اور جلوہ نمائی سے بے خبر نہیں بلکہ ہر لحظہ اکتساب و احتساب کرتے ہیں۔ وہ آس پاس کے واقعات اور روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں اور حادثوں اور طبقاتی زندگی کی کش مکش کی توجیح و تشریح ایسے تجزیاتی انداز سے کرتے ہیں کہ ان کی سچائیاں، سچ کے ناپید کنارِ سمندر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ممکن ہے یہ حقیر و کم آمیز سچائیاں ان کے قارئین کو بعض اوقات متوجہ نہ کر سکیں۔ کڑوی، کسیلی اور گھناؤنی نظر آئیں مگر اس کے باوصف ان سچائیوں کے پروں زنگار سے ایسی حقیقت جھانکتی دکھائی دیتی ہے، جو اپنے اندر سچ کے سمندر کا حصہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے جسے نظر انداز یا جس سے پہلو تہی کرنا بہت بڑی خرابی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ ممتاز مفتی کے ہاں ادب اور زندگی کے شعوری فارمولے کسی سیاسی یا گروہی مصلحت کی بنا پر نہیں بلکہ زندگی سے اس کی گہری دلچسپی اور نفسیاتی لگاؤ کی بنا پر اس طرح کند گئے ہیں کہ زندگی کی بے پناہ خراشیں اپنے حسن و قبح کے ساتھ اُبھرتی ہیں۔ ممتاز مفتی نے خصوصیت کے ساتھ اپنے افسانوں کے خام مواد یا موضوعات کے لیے عام طور پر متوسط طبقے کی زندگی کا سہارا لیا ہے۔ ان کے افسانوں کو اسی متوسط طبقے کی ایک ایسی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اس طبقاتی دور کی سچائیوں کے ''سوم سر'' سے ہی کسب نمو کرتی ہیں۔ ممتاز مفتی نے ہمارے متوسط طبقے کے مسائل و معاملات کی گھٹی گھٹی فضا، مختلف انسانی رشتوں کے دبے دبے کرب، سماجی، ثقافتی اور معاشی بے چینی کو جس درد و سوز اور آرزومندی کے ساتھ سمجھا اور پیش کیا، یہی نہیں بلکہ ان رموز و علائم کا جس ژرف نگاہی اور باریک بینی کے ساتھ تجزیہ اور تحلیل نفسی کی ہے اس کی روشنی میں ممتاز مفتی کو تجزیاتی ادب کا پیش رو کہا جا سکتا ہے اور اس طرح انھوں نے کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی سے الگ تھلگ اپنے لیے ایک اہم ادبی مقام حاصل کر لیا ہے۔

بعض ناقدین کے نزدیک فلسفہ ونجس کا یہ نفسیاتی تجزیہ اور تحلیل نفسی ادیب کو ایسے موہوم اور غیر مرئی گڑھوں میں پھنسا دیتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق سے نظر چرا کر یوں بھول بھلیوں میں گم ہو کر زندگی سے فرار اختیار کر لیتا ہے۔ ممتاز مفتی نے نفسیاتی تجزیے اور تحلیل نفسی کو اس طرح نہیں برتا ہے۔ اُن کے ہاں افسانہ، ڈرامہ، ناول، طنز و مزاح، انشائیہ اور شخصی خاکہ حتیٰ کہ سفرنامہ اظہارِ ذات کے ساتھ اظہارِ فن سے پروان چڑھے ہیں۔ اسی لیے اُن کے ہاں تخلیق عمل کی فضا و ہوا (Atmosphere & Climate) نفسیاتی کیف و کم اور واقعات و جزئیات اس طرح گھنے ہوئے ہیں کہ ان تخلیقات کی بُنت ایسا جاندار نمونہ پیش کرتی ہے کہ ان میں سے ایک لفظ کے تار حریر کو بیان سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ممتاز مفتی ایک اور حوالے سے بھی اردو ادب میں اہم مقام کے حامل ہیں، وہ اس طرح کہ انھوں نے زمین کی خوشبو، شہری اور دیہی پنجاب کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی سرمستی اور گھٹن کو بڑے مترنم اور دل نشین انداز میں پیش کیا ہے میری مراد ہے کہ مفتی نے اکثر اوقات اپنے افسانوں کا موضوع آلو چھیلتی، پیاز کاٹتی، مصالحہ پیستی اُن الھڑ اور نوخیز لڑکیوں کو بنایا ہے جو کبھی بند گلیوں اور کبھی کونے کھدروں اور کبھی چھتوں چوباروں سے لک چھپ کر جوان لڑکوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ ان کی خوشیاں ان کے غموں کی ہلکی گہری پرچھائیاں اور ان ہی کے اداس اونگھتے ہوئے دن رات مفتی کے کرداروں میں کہیں زندگی کا رس اور کہیں ایسا مٹھاس بھرا زہر گھولتے ہیں، جس میں مرنا نہیں بلکہ زندہ رہنے کا ایک ایسا لطیف سا احساس ہوتا ہے جو برسات کی ہری ہری دھوپ کی طرح پھیلتا اور پھر آہستہ آہستہ کبھی زمین کی غذا بن جاتا ہے اور کبھی خس و خاشاک بن کر بکھر جاتا ہے۔

ممتاز مفتی نے جنس کے اظہار و ابلاغ کے لیے افسانہ نگاری ہی نہیں بلکہ اپنی تمام ادبی تخلیقات کے لیے سب سے الگ، ایک علیحدہ زبان وضع کی ہے۔ ایک منفرد پیرائیہ بیان کو اپنایا ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور سادہ و آسان بھی۔ ان کی زبان اور طرز ادا سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، ل۔ احمد اور خلیق دہلوی کی ٹیگور طرز کی اردو یا کرشن چندر کی لچک دار شعری زبان سے خاصی مختلف ہے۔ وہ سادہ اور سلیس زبان میں مشکل جنسی اور بسا اوقات نفسیات

کے الجھے سلجھے مسائل شرح و بسط کے ساتھ اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ عام قاری بھی تھوڑی سی کدو کاوش کے بعد انہیں سمجھ لیتا ہے۔ مفتی نے ۱۹۳۶ء سے باقاعدہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اب ۱۹۸۷ء میں اکیاون سال بعد ''آپا''، ''دودھیا سویرا'' تک پہنچ کر وہ خود کہتے ہیں۔

''اس دوران میں میری تحریر نے کئی روپ بدلے، زاویے بدلے، رُخ بدلے، اسلوب نے رنگ بدلے اور انداز بدلے۔۔۔ مجھے ایک زعم ضرور ہے میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اظہار میں غلو، بناوٹ یا رسمی بیان نہ آنے پائے۔ بات میں سادگی ہو۔ روانی ہو۔ سچائی ہو۔ میرے سچ میں کتابی رنگ نہ پیدا ہو۔ کہانی لکھی نہ جائے۔ کہی جائے۔ سنائی جائے۔''

کیا افسانے کا افسوں ہو۔ کیا ڈرامے کا غیر معمولی نقطۂ عروج ہو۔ کیا آپ بیتی یا ناول نگاری کی بسیط اور پھیلی ہوئی دنیا ہو۔ کیا شخصی خاکوں کی اوکھی شخصیات ہوں۔ کیا طنز و مزاح کی شوخی اور بے ساختہ پن ہو۔ کیا سفرناموں کے انجانے راستے ہوں یہ خیالات مفتی اور ان کی ادبی تخلیقات کو سمجھنے اور پرکھنے میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔۔۔ اس میں کسی شک اور شبہے کی گنجائش نہیں کہ ممتاز مفتی کی قصہ گوئی کی اساس دنیاوِ جنسی نفسیات ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا منشاء و مقصد جنسی بے راہ روی کو پیش کر کے سطحِ شعور میں ہیجان پیدا کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ان پر بھی منٹو کی طرح، بہ ایں عظمتِ فن، یہ اعتراض وارد ہوتا کہ وہ جنس اور اظہار جنس کے مشکل مرحلے اور معاملے میں وقت اور ماحول کے ساتھ بہہ نکلتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جس پر قابو پانا اور قلم کو افراط و تفریط سے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جنس کو موضوع بنانے والے ادیب کے لیے یہی سب سے مشکل اور صبر آزما مقام ہے اور اس عنکبوت سے کامیاب و کامگار باہر نکل آنا بڑا دشوار عمل نظر آتا ہے مگر جس طرح ممتاز مفتی اس جالے کو توڑے بغیر اس سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ ان پر منٹو یا عصمت کی طرح فحش نگاری کا نہ کوئی مقدمہ چلایا جا سکا اور نہ ہی ان کی تحریروں کو عریانی کا ہدف بنایا گیا۔

اس کی غالب وجہ میرے نزدیک ممتاز مفتی کا رمزی، ایمانی اور تجزیاتی اظہار کے علاوہ ہند آریائی دیو مالا سے لگاؤ ہے جس کا سہارا لیتے ہوئے انھوں نے جنس کو معمالیاتی احساس و شعور اور ایک ایسے معاشرتی تصور سے پیش کیا جس میں ایک انجانے کیف اور سرمدی سرور میں ستر کھلتے اور بند ہوتے محسوس ہوتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ یہی وہ مقام ہے جو ممتاز مفتی اور ان جیسے دوسرے ادیبوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔ اس کی سب سے اعلیٰ مثال ''دودھیا سویرا'' ہے جس میں ایک کھدر پوش تین دن اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک بُلند پہاڑ کے غار میں رہا اور اُس نے محسوس کیا۔

''ان تین دنوں میں، مَیں نے اس کے جسم کے ایک ایک حصّے پر سجدے کیے۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں۔ اس کے روبرو بھجن گائے۔۔۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر ادھر فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دودھیا سویرا ہوتا ہے۔ اس بُلندی پر یہاں صبحِ صادق کے دودھیا سویرے کو قیام و دوام مل جاتا ہے اور دودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ ادھر ہی کو اٹھتی ہیں اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ اڑ رہا ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرے نزدیک یہ ممتاز مفتی کے طویل ادبی سفر کا اہم موڑ ہے جو ایک ایسی منزل کا سراغ دیتا ہے جس کی تلاش میں وہ جسم و جنس کے وراد سے بطنِ روح کے ماوَرا تک پہنچ گیا ہے۔ جو اسے نئے اسرار و معانی سے آشنا کراتا ہے۔ جس کی روشنی اور طلعت میں ایک خاص ماحول اور اس کے لوازم سامنے آتے ہیں۔ حرکت کی عجیب و غریب راہیں کھلتی ہیں اور عمل کے حیلے پیدا ہوتے ہیں اور جسم و روح کی روائی کی باطنی تجربے سے ایک ایسے (سینتھی سس Synthesis) سے ہمکنار کر دیتے ہیں کہ اسرار حیات و ممات آپ سے آپ۔۔۔ ہونے لگتے ہیں۔ دراصل یہی وہ منزل ہے جو ممتاز مفتی کی ادبی شخصیت بلکہ ادبی مقام کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے اور جسے رینے ویلک (Rene Wellek) اور آسٹن وارن (Austin Warren) نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"Psychology can illuminate the creative process"

اور نفسیات کے اس عرفان و آگہی نے ممتاز مفتی کے تخلیقی عمل کو وہ روشنی، وہ گہرائی و گیرائی بخشی ہے جو اصل و اصول حیات ہے۔

☆

اردُو ادب کا مہاتما بدھ

ممتاز مفتی اردو ادب کا ایک عظیم لیجنڈری کردار ہے وہ متنوع اصناف پر لکھنے والا ایک ایسا لکھاری ہے، جس کی تحریر میں ایک عجیب بانکپن اور ندرت ہے۔ وہ اردو افسانے میں اپنی طرز کا واحد افسانہ نگار ہے۔ اس کی تحریروں کی ایک اور خوبی لفظوں کا بے ساختہ اور برملا استعمال ہے اسے لفظوں کے استعمال اور چناؤ پر ملکہ حاصل ہے یوں لگتا ہے جیسے لفظ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں جن کو وہ اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی کتابیں بے حد ضخیم ہیں اور اسی لیے تحریروں میں متعدد جگہ وہ لفظوں کی فضول خرچی کا بھی مرتکب ہوا ہے۔

''علی پور کا ایلی'' اور اس کے بعض دوسرے افسانوں میں کرداروں کی مماثلتیں موجود ہیں ''الکھ نگری'' میں خاکے بھی اس کی تحریروں میں مکرر بیان ہوئے ہیں اس کے تخلیقی سفر کی ابتداء میں عورت اس کے ذہن پر سوار ہے اور وہ اس کے افسانوں کا مرکزی کردار ہے۔ اپنی تخلیقی زندگی کے وسطی دور میں اس نے اپنی تحریروں میں تصوف کا تڑکا لگایا ہے لیکن چونکہ وہ خود اس میدان کا شہسوار نہ تھا اس لیے اس نے جو واقعات لکھے وہ اوپرے اوپرے سے لگتے ہیں پھر جب بات نہ بنی تو اس نے ایک اور شخصیت کو اپنی تحریروں کا مرکز بنایا اس لیے کہ ذاتی سطح پر بھی وہ اس کا ممنون واحسان مند تھا اس کا یہ افسر قدرت اللہ شہاب تھا۔

حال ہی میں شائع ہونے والی ممتاز مفتی کی تازہ کتاب'' الکھ نگری'' قدرت اللہ شہاب کے احسانات کا بدل اور اس کے لیے خراج عقیدت ہے ممتاز مفتی ایک پُر اسرار شخصیت کے حامل ادیب ہیں تمام زندگی انہیں ہر آڑے وقت میں بابے ملتے رہے ہیں زندگی کی کٹھالی

میں پک کر اب وہ خود ایک بابے کا روپ دھار چکے ہیں انہیں یہ درویشی بیٹھے بٹھائے نہیں ملی بلکہ انہوں نے اس کے لئے بڑا کشٹ اٹھایا ہے۔ ممتاز مفتی اس راز سے پردہ سرکائیں یا نہیں دراصل قدرت اللہ شہاب ہی ان کے اصل مرشد ہیں۔ جن کے قدموں کے تعاقب میں وہ تصوف کی اس وادیٔ پُر خار میں داخل ہوئے اور پھر اسی کے اسیر ہو کر رہ گئے اسی لیے کہ اس میں داخل ہونا تو آسان ہے لیکن ان راستوں سے واپسی ناممکن ہے کیونکہ یہ وہ کمبل ہے جسے آدمی تو چھوڑتا ہے لیکن کمبل اسے نہیں چھوڑتا۔

ممتاز مفتی ایک حقیقی تخلیق کار ہے لفظوں کی زبان سمجھتا ہے اور کہانی کہنے کا ہنر جانتا ہے افسانوں کے علاوہ ممتاز مفتی نے ادب کے دیگر میدانوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے خاکوں کی تین کتابیں اردو خاکہ نگاری میں اہم ترحیثیت کی حامل ہیں اور اس کے خاکے ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے اس کے افسانوں کی طرح بے حد منفرد ہیں۔ ممتاز مفتی اگر ان دو اصناف تک ہی محدود رہتے تو موزوں ہوتا اور اس سے ان کی تخلیقات میں مزید نکھار پیدا ہوتا۔

ممتاز مفتی نقاد کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن میری رائے میں نقاد ادب کی ترتیب وتزئین کے لیے ایسے ہی اہم ہیں جیسے قلم میں سیاہی اس لیے کہ ہر تحریر ادب نہیں ہوتی اور یہ نقاد کا کام ہے کہ وہ کانٹ چھانٹ اور جھاڑ کر تحریر کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائے اور اس کی چیر پھاڑ کرے اس لیے کہ اگر نقاد نہ ہو تو ادب میں بے مقصد اور غیر معیاری تحریروں کا انبار لگ جائے۔

ممتاز مفتی کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اردو ادب کے نقاد نے ممتاز مفتی کو ''آپا'' سے شروع کر کے ''آپا'' پر ہی ختم کر دیا اس لیے کہ ہماری تنقید میں تحقیق و تلاش کے عنصر کی کمی ہے حالانکہ وہ اپنے عہد کے افسانہ نگاروں سے بہت آگے ہیں اور بیسویں صدی کے اہم ادیب ہیں لیکن ہمارے ہاں کے پیشہ ور نقادوں نے اس کو دنیائے ادب میں وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق ہے۔ میں اسے بیسویں صدی کے عظیم ادیبوں چیکوسلاواکیہ کے فرانز کافکا، آئرلینڈ کے جیمز جوائس اور فرانس کے جین پال سارتر کے ہم پلہ ادیب قرار دیتا

ہوں۔اس کے بہت سے افسانے۔فنِ افسانہ نگاری کی انتہا کو چھوتے نظر آتے ہیں وہ ایک حقیقی تخلیق کار کی طرح نمود و نمائش سے عاری اپنے ذہنی افق کو وسیع و بلند تر کرتا رہا ہے اس کے افسانوں کے محرکات انسان کو جاننے کا ایک عمل ہے۔ وہ عمر بھر انسانی نفس کی پیچیدگیوں اور تہ داریوں کا مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ وہ انسان کے لاشعور میں چھپی خواہشات کا کھوج لگا کر انسان کے دکھوں کا تعین کرتا ہے" ان کہی" سے" کہی نہ جائے" تک کی ۵۵ برس کے وقفے کے دوران وہ ان ہی لاینحل مسائل کو سلجھاتا رہا ہے۔

ممتاز مفتی کا حج کے بارے میں سفرنامہ جو اس نے ۱۹۸۶ء میں قدرت اللہ شہاب اور ان کی اہلیہ کے ہمراہ کیا دراصل تشکیک سے عبودیت تک کے سفر کی کہانی ہے جو محبت پیار اور خلوص میں گوندھ کر لکھی گئی ہے۔ یہ ممتاز مفتی کے تخلیقی سفر کا ایک اہم موڑ ہے تقریباً نوے برس کی عمر میں وہ ایک سادھو کی مانند تحریروں کی دھونی جمائے بیٹھا ہے ایک لمبی سوچ میں گم کسی اوران کہی کے انتظار میں اس برس شائع ہونے والی اس سال کی ضخیم ترین کتاب " الکھ نگری" میں جہاں وہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی کے اسرار کھولتا رہا ہے وہاں وہ خود اپنی سابق تحریروں کے خلاف اپنے آپ کو لپیٹتا رہا ہے اس کی تحریروں میں پیار ہے، امن کی خوشبو ہے، اپنی زندگی سے مطمئن وہ پاکستان کے بارے میں بے پناہ خواب اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے ہے اسے امید ہے کہ اس مملکت خداداد کی عظمت کا سورج جلد ہی طلوع ہونے والا ہے وہ شدت سے اس دن کے انتظار میں ہے۔

-☆-

مفتی جی خیمہ ساز

جب کوئی بزدل بہادر میدان ِ جنگ ہار کر شام کے اندھیرے میں معدوم ہوتا چلا جاتا ہے تو فنا اس کی ناطاقتی کا فائدہ اُٹھا کر ایسا بھالا مار گراتی ہے کہ دیر تک فضا میں اس کے گرنے کی صدا کبھی آہستہ کبھی Echo بن کر آتی رہتی ہیں۔ اسے زمانہ دیر تک بھول نہیں پاتا۔

ممتاز مفتی کے جانے کے بعد ابھی تک اس کے گرنے کی دھب دھب سنائی دیتی ہے اور ہم اس جگت استاد کی باتوں سے خالی نہیں ہوئے۔ آپ سب مفتی جی کی شخصی حکومت سے تو واقف ہیں، اور انہیں مجھ سے بہتر طور پر جانتے سمجھتے اور پہچانتے ہیں لیکن ایک بات کا شاید آپ کو علم نہ ہو کہ مفتی جی خلاصی تھے۔ پتہ نہیں حرفت سے اتنا گہرا شغف عکسی مفتی نے ان سے اخذ کیا کہ مفتی جی نے لوک ورثہ کے عکسی کی نقالی میں منجو ہاتھ میں پکڑا اور خیمے اُستارنے اور شامیانے، چھولداریاں کھڑا کرنے کا فن سیکھا۔ شادی بیاہ کی رسومات سے پہلے صبح کے وقت تنبو، قناتیں لگانے والے آیا کرتے ہیں۔ ان کی چال ڈھال سے شبہ نہیں ہوتا کہ یہ میخیں ٹھونک' طنابیں کھینچ رسیوں میں گانٹھیں ڈال یوں شامیانے قناتیں لگائیں گے کہ جنگل میں منگل ہو جائے گا۔

مفتی جی بھی گُدیا آدمی تھے۔ ان کا بنیادی پیشہ بھی شامیانے، چھولداریاں، قناتیں، دو آشیانے اور شبنمی سائبان نصب کرنا تھا۔ وہ توجہ سے میخ ٹھونکتے، پھر ڈھیلے کپڑے کی اٹھان آنکتے اور طناب کو جھٹکا دیکر ایسی گرہ دیتے کہ پل بھر میں شاہی خیمہ مغلوں کی یاد دلانے لگتا۔ مفتی جی انسانی سرشت کے بڑے نباض تھے۔ انہوں نے داروغہ گھاٹ کی طرح رنگ

رنگ کے آدمی کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے ارد گرد وقت ضائع کرنے والے جھگڑالو، ناکارہ اور احساسِ کمتری میں مبتلا لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ بے جان گرے پڑے کپڑے سے ڈھلے زمین دوز لوگ مفتی جی کی کاریگری کے منتظر رہتے۔ وہ بڑی آسائش، چابکدستی اور ہنر مندی سے ان لوگوں کو منڈل' درباری' شامیانہ' عجائبی چھولداری کی طرح کس کسا کر قابل دید بنا دیتے۔

مفتی جی نے ساری عمر سکول ماسٹری نہ چھوڑی۔ وہ ڈوبتے کو تیرنا سکھاتے تپ دق کے مریض کو ٹینس کا ریکٹ سیدھا پکڑنے کی ترکیب بتاتے۔ کبھی شاباش دیکر کبھی مرغا بنا کر (Attention) کا کاشن دیتے۔ کبھی فرائیڈ کی طرح آنکھ مار کر چوری چوری پکڑ لینے کا سبق دیتے۔ کبھی قدرت اللہ شہاب کی لاٹھی تھما دیتے کہ لے بچہ رام بھلی کرے گا۔ جب تک انسانی سرشت سے واقفیت کم تھی جنس میں پناہ تلاش کی۔۔۔ وسعت پیدا ہو گئی تو سرنگوں سوالی کا رشتہ غیب سے جوڑ کر آسرا دے دیا۔۔۔۔ اس خیمے نصب کرنے والے کا بس ایک ہی مسلک تھا۔ وہ کسی کو سینے پر سر جھکا کر بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے اندر رنگ ماسٹر' سکول ٹیچر اور ڈرل ماسٹر اکٹھے رہتے تھے۔ اس لیے عموماً جس کی مدد کرتے اس کے جسم میں آنکھیں ضرور پیوست کر دیتے۔ اسے زندہ کرنے اور رکھنے کے لیے شاک تھراپی بصورت جھڑپ اور جھنجھٹ اور جھگڑا رکھتے۔

خود مفتی جی کو نہ شور پسند تھا نہ جھگڑا، وہ تو ایسی موسیقی بھی پسند نہ کرتے تھے جو ناچنے پر مجبور کر دے، لیکن کسی گری چھولداری، الجھے ہوئے شامیانے کو دیکھ کر وہ فوراً اعلان جنگ کر دیتے۔ میدانِ جنگ میں گھسیٹ لینے کے بعد انہیں یقین ہوتا کہ اب ہر مردہ اپنا بچاؤ خود کرے گا۔ خوشبودار پان' ہومیوپیتھک پڑیاں' بحث مباحثہ اُن کی warming up ورزشیں تھیں۔۔۔ اصل تعلق بہت بعد میں استوار ہوتا۔

پتہ نہیں کیوں اور کیسے جو حقیقتیں خبر گیر اور دیرپا ہوتی ہیں۔ ان کے نزول و ورود کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوتا، وہ جنگ میں چلنے والی پہلی گولی کی طرح اچانک اور نتائج میں دور مار ہوتی ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ممتاز مفتی' اشفاق احمد اور انشا جی کب اور کس

طرح مربوط ہوئے۔۔۔منبع کہاں تھا اور کیوں تھا یہ لمبے تجزیے اور قیاس پر مبنی ہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ شہاب صاحب کے حضور ممتاز مفتی کاریگر نہ تھے۔ان کے ہاتھ سے طنابیں، رسیاں، منجو سب گر گئے اور وہ خود ایک پھٹی ہوئی چھولداری بن گئے۔عاشقوں کے مابین ربط باہمی کے علاوہ تھوڑا بہت حسدِ خفی بھی ہوتا ہے۔شہاب صاحب سے تو جھگڑے نے کبھی جنم نہ لیا۔لیکن ان یاروں کی آپس میں بے باکی بڑھ گئی۔

ان دنوں ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ابھی مفتی جی ہماری طفل تسلیوں میں مشغول تھے۔ہم دونوں نے پر پرُزے نہ نکالے تھے کیونکہ غریبی کا زمانہ تھا۔آپ جانتے ہیں۔غریب آدمی یا تو بات نہیں کرتا یا پھر کہہ سُن کر پچھتاتا ہے۔شہاب صاحب سے ابھی مفتی جی کا سمبندھ نہ بنا تھا اور ہم پر یہ چارج تھا کہ ہم ایک بڑے افسر کی خوشامد درآمد میں مبتلا رہ کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں۔اس پر دو چار بار مفتی جی نے ہمیں آنکس مار کر چالو کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی ہم اپنا نقطۂ نظر، آرزو اور عندیے کو سمجھانے کے قابل نہ ہوئے تھے۔اس لیے چپ چاپ جنم روگی بنے رہے۔

لیکن 1967ء تک ہم بھی کچھ کچھ شتر بے مہار ہو گئے۔ہمیں بھی نظریاتی بحثوں میں لطف آنے لگا۔ہم 75.جی میں مقیم تھے اور اظہار برملا کی عادت پڑنے کو تھی۔یہاں مفتی جی سے پہلی جھڑپ ہوئی۔ادیب چونکہ ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا دعوی کرتے ہیں۔اس لیے آپس میں جھپٹنے کی ناسمجھی ہو ہی جاتی ہے۔لیکن مفتی جی اور میں تو ہمیشہ مختلف سمت میں دیکھنے کے عادی تھے۔تعجب کی بات صرف یہ ہے کہ ہر اختلاف کے بعد مفتی جی مجھ پر زیادہ مہربان ہو جاتے اور میں اس خیمہ ساز پر پہلے سے زیادہ اعتماد کرتی۔اس لئے جھگڑا لازمی تھا۔

75.جی ماڈل ٹاؤن کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔اس کا ڈرائیووے نصف دائرے کی شکل میں دو پھاٹکوں پر منتج ہوتا تھا۔راستے کے گھیرے میں ایک کھلا لان تھا۔شام گزر چکی تھی۔پورچ کی دھیمی بتی براؤن فوکسی پر پڑ رہی تھی۔سمن آباد کے دس مرلہ مکان سے یہاں کا کھلا گھر مختلف تھا اور ایک نئے ایکسپوزر (exposure) کا باعث بھی ہوا تھا۔اب بات کرنے

سے پہلے چپ نہیں لگتی تھی۔

مفتی جی نے ڈرائیوِوے پر بکھری پڑی اینٹ اٹھائی اور اس پر بیٹھ گئے۔۔۔ میں نے ان کی نقل میں ایک براؤن اینٹ کو جھاڑ کر رکھا اور اس پر جم گئی۔ اچھا زمانہ تھا گھٹنے ابھی ایسی نشست قبول کرتے تھے۔

مفتی جی گویا ہوئے'' تم نے جو خط لکھا تھا اس سے دوستی کی خوشبو ہرگز ہرگز نہیں آتی وہ خیر خواہی پر مبنی ہے اور گو میں کمینہ ہوں لیکن دنیا دار نہیں ہوں۔''

میں اس جرم بکار سرکار کی پیشی کے لیے تیار نہ تھی۔ میں نے خط کی وضاحتیں پیش کیں۔ مفتی جی اور میرے درمیان احترام اور تعلق کی جو دیوار حائل تھی اسے بارِ ثبوت کے لئے پیش کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ ڈرتے ڈرتے بارک ماسٹر مفتی جی سے عرض کی کہ میرے نزدیک دوستی کی اہم ترین باقی جمع خیر خواہی ہے اور کسی طور بھی اسے ہاتھ سے چھوڑنا بالکل چوری ہے۔

مفتی جی کا موقف تھا کہ دوستی میں خیر خواہی قسم کا زہر نہیں ملایا جاتا یہ راستہ سمجھانے کا نہیں ساتھ چلنے کا عمل ہے۔ میں بضد تھی کہ دوست کا اولین فرض دینی بھائی کی طرح گرنے سے بچانا۔ آگ میں بھسم ہوتے نہ دیکھ سکنا اور فقیری گٹکے استعمال کر کے غلط راستوں سے روکنا ہے۔ انہوں نے سختی سے الزام لگایا کہ یہ خیانت مجرمانہ ہے اور مجھ جیسے محتسب کا میخانے کی سرمستی سے کوئی سروکار نہیں میں نے ہانک لگائی کہ نیت پر شبہ کرنا دوستی کی توہین ہے۔ وہ بولے ذاتی جوہر سے محروم کی قیمت آنکنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

ہم دونوں اپنے اپنے نظریے پر جمے رہے بحث لمبی ہوتی گئی لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچی جب بچوں نے آ کر اینٹوں سے اٹھایا تو مفتی جی میرے بہترین بہی خواہ تھے اور میں نے دوستی کا علم اٹھا لیا تھا۔ وہ میرے دلائل دے رہے تھے اور میں ان کا علم اٹھائے ہوئے تھی۔

یہ میچ ڈرا Draw ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ فضا بہت خاموش رہی اور دونوں نے ہر قسم کے میچ سے بائیکاٹ کر لیا۔

مفتی جی کو شاید نماز اور خوشبو زیادہ پسند نہ تھی لیکن وہ نفسیاتی، جبلی اور جذباتی طور پر

عورت سے بہت وابستہ تھے۔ وہ عورتوں کے رابن ہڈ تھے اور اپنے اس رول پر فخر بھی کرتے تھے، جب کبھی کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے تو اس میں بدوبدی محبوب کو مظلوم سمجھنے کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مفتی جی کے اعصاب پر اپنی ماں اس درجہ طاری تھی کہ پھر ساری عمر وہ ہر عورت کو مظلوم ہی سمجھتے رہے۔ عورت کے مقدمے کی پیشیاں بھی وہ مفت ہی بھگتتے رہے اور کبھی مقدمے کے لیے کسی عورت سے مسکراہٹ بھر معاوضہ بھی قبول نہ کیا۔

ہم دونوں کی جھڑپ اس سلسلے میں ہوتی رہتی تھی۔ میں کہتی "مفتی جی سوچ میں ڈنڈی نہ ماریں، انصاف سے کام لیں، انصاف سے۔ جو صدیوں مرد کا مال کھاتی رہی ہے اس مظلوم نے بھی استحصال کرنے کے کچھ شعوری لاشعوری طریقے سیکھ لیے ہوں گے۔۔۔ مفتی جی ظلم کے خلاف لکھیں مظلوم تو بدلتا رہتا ہے۔ کبھی مرد ظالم ہوتا ہے کبھی عورت۔۔۔ یا یوں کہیے دونوں ہی کبھی بیک وقت کبھی الگ الگ مظلوم ہیں۔ ہمیشہ مزدور کو مظلوم سمجھنے سے وہی انجام ہوگا جو روس کا ہوا۔۔۔ ہمیشہ حکومت کو ظالم سمجھنے سے پاکستان جیسے ناقابل فہم حالات پیدا ہو جاتے ہیں"۔

مفتی جی دعویٰ پیش کرتے" کڑیئے عورت پر مرد نے صدیوں ظلم کئے ہیں وہ اسے مارتا ہے اسے جوتی کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کی آزادی سلب کرتا ہے"

میں عداوت کے انداز میں اپیل کرتی "مفتی جی سوچ سیدھی کریں آپ کی بات درست ہے لیکن ہمیشہ نہیں۔ کبھی معاشرہ ظالم ہوتا ہے کبھی فرد۔۔۔ زرعی دور کی اپنی مصیبتیں تھیں، مشینی دور کے اپنے ظلم ہیں۔ اب روزی کمانا اور روزی خرچ کرنا اپنی اپنی جگہ ظلم کے مقامات ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ان پرنالوں میں بھیگتے رہے ہیں"

مفتی جی کی براؤن آنکھیں غصے سے اور بھی پھیل جاتیں "اوئے بیوقوف احمقے عورت تو دکھنا چاہتی ہے پھول ہے پھول"۔

" تو دکھ تو رہی ہے مفتی جی۔۔۔ کبھی ماڈل بن کر، کبھی چھوٹی یا بڑی سکرین پر جگمگا کر۔۔۔ روک کون سکتا ہے اسے"۔

مفتی جی بھر جاتے۔۔۔" مرد کا ظلم یہ ہے کہ وہ عورت کو دکھنے نہیں دیتا۔ اسے چادر

اور چار دیواری میں بند رکھتا ہے۔ اسے اپنا نیچرل ٹیلنٹ استعمال نہیں کرنے دیتا، اسے مشقت کے حوالے کر دیتا ہے" میں بھی کنیر کا پھول بن جاتی "مفتی جی اگر آپ اپنی آنکھوں سے یہ براؤن کانٹیکٹ لینز (contact lens) اتار دیں تو آپ کو پتہ چلے کہ مرد اور عورتیں بنیادی طور پر دونوں مشقتی ہیں۔ دکھنا دکھانا بہت کم سالوں کی عیاشی ہے۔ دونوں کی مشقت مختلف ہے۔ وہ ساری عمر کفالت کرتا ہے اور اندھا' کبڑا اور ناطاقتا ہو کر آخری عمر میں کھانستا رہتا ہے۔ آخر کو اکیلا ہی سدھار جاتا ہے۔ عورت کی مشقت رنگ لاتی ہے۔ بڑے ہو کر بچے رکشا پر لکھاتے ہیں "ماں کی دعا جنت کی ہوا"۔۔۔۔ مرد ساری عمر جھڑکیاں کھا کر دھکے برداشت کرتا ہوا کفالت کی راہ نہیں چھوڑتا۔ مکان بنواتا ہے پردیسوں کی مٹی پھانکتا ہے۔ آخر میں جوان بچے کہتے ہیں ابا جی اگر آپ کوئی ڈھنگ کا کام کر لیتے تو زندگی نہ سنور جاتی۔۔۔"

"تیری کوئی بیٹی نہیں اس لیے تو کنیا دان نہیں جانتی کٹھور عورت کچھ ظلم مرد خصوصی طور پر عورت کے وجود اس کی وفا اور جذبات پر کرتا ہے۔۔۔"

"اور مفتی جی ایسے مظالم عورت کبھی بھی مرد کی خاطر برداشت نہیں کرتی۔ اسے بچے کی خاطر ظلم کی بانبی میں ہاتھ دینا ہوتا ہے۔ اگر مرد عورت کا قافیہ تنگ کرے تو علیحدگی کا راستہ ہے لیکن اگر بچہ عورت پر ظلم کرے تو وہ اس کا کسی سے ذکر نہیں کرتی۔"

"تم کیا ہو۔۔۔ دیکھتی نہیں ہو کہ عورت کی جوانی کتنی رائیگاں جاتی ہے باقی کیا رہتا ہے کچھ سال کے بعد۔۔۔"

"اس لیے مفتی جی کہ باقی رہنے کے لیے اپنے میں گن پیدا کرنے پڑتے ہیں' جب ماڈل بن کر کام چل سکے تو عورت اپنے میں وہ گن کیوں پیدا کرے جس کو حاصل کرنے کے لیے برسوں درکار ہوتے ہیں۔ اپنے لیے کسی وصف کا تلاش کرنا تو صحرا کا سفر ہے' مفتی جی پانی ملے ملے نہ ملے نہ ملے۔"

اب نہ مفتی جی رسی کا سرا چھوڑتے نہ میں رسی ڈھیلی کرتی۔۔۔ بحث کھنچتی وہ حیران ہوتے کہ میں عورت ہو کر عورت کو مظلوم نہیں سمجھتی، میں اس بات پر بضد رہتی کہ بات صرف

ظلم کی ہونی چاہیے، مظلوم بدلتا رہتا ہے۔۔۔کبھی مرد ظالم کبھی عورت۔۔۔اور ظلم کا تیسرا کونہ بچہ۔۔۔بچے جیسا ظالم تو نہ دیکھا نہ سنا لیکن اس کے خلاف کون سی عورت ہے جو زبان کھولے؟

آخر مفتی جی میچ فکسنگ کے لیے مشورہ دیتے بحث ہار جیت کے بغیر ختم ہو جاتی تو مفتی جی کہتے "کاکو ہم دونوں ملکر ایک کتاب لکھیں عورت پر۔۔۔ ایک باب تم لکھو۔۔۔ایک میں۔۔۔کتاب چھپ جانے تک نہ تمھیں علم ہو کہ میں نے کیا لکھا ہے اور نہ مجھے معلوم ہو کہ تمھارے خیالات کیا ہیں۔۔۔" ہماری بحثوں کی طرح یہ منصوبہ بھی ادھورا رہا لیکن مجھے اتنا ضرور علم ہے کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو مفتی جی اس کا سارا کریڈٹ مجھے دیتے اور سارا الزام اپنے سر لیتے کہ ان کی محبت میں اولین ریت ہی یہ تھی۔

آج کے زمانے میں جب ہر انسان کو اپنے متعلق یہ یقین ہے کہ وہ حساس بہت ہے اور لوگ اس کا دل دکھانے میں مشاق ہیں ایسے لوگوں کو علم نہیں کہ اصلی بڑا ادیب اپنے معاملے میں کبھی حساس نہیں ہوتا۔ وہ چور، وِلن، آوارہ عورت، سمگلر، دہشت گرد حتیٰ کہ قاتل کے بارے میں بھی حساس ہوتا ہے۔ لیکن مفتی جی کی طرح اپنی اسے پروا نہیں ہوتی۔ کچھ ادیب تو اشفاق احمد کی طرح اس درجہ دودلے ہوتے ہیں کہ اپنی تحریر میں کوئی وِلن ہی تخلیق نہیں کر سکتے اور ہمیشہ کہانی میں خیال، ارادے، تجویز کو دشمن انسان بنا کر دوزانو ہو کر سارے کرداروں کے سامنے ہی بیٹھے رہتے ہیں۔

مفتی جی نے اپنی زندگی کے کسی مقام پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ حساس ہونا چھوڑ دیا جائے اور لوگوں کا منہ بند کرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ انسان اپنے ظاہر اور باطن کے تمام عیوب خود بیان کرنے میں مصروف رہے۔ مفتی جی بھی میری طرح خوفزدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ایسے پُرخوف آدمی جو شدید خوف کی حالت میں تلوار لیکر میدان جنگ میں اتر جاتے ہیں۔ مجھے ان کے سچ سے بڑی چڑ تھی اور میں اس سلسلے میں کئی دھرنے دے چکی تھی۔

مفتی جی۔۔۔آپ کو اپنی ذات کے متعلق سچ بولنے کا صرف اتنا حق ہے کہ آپ

اپنے آپ کو گزند پہنچائیں جب آپ سارے گھرانے کو اپنے دوستوں کو سچ کی وجہ سے آزار میں مبتلا کر دیتے ہیں تو یہ زیادتی ہے۔ ہم سچ ضرور بولیں۔۔۔ لیکن اپنے حصے کا۔۔۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے سچ سے کسی دوسرے کی زندگی میں زہر گھولوں۔"

لیکن مفتی جی تو بزدل بہادر تھے ٹین کی تلوار لیکر نکلنے والے سپاہی تھے۔ ان کی پتلیاں خوف سے پھیل جائیں اور وہ بضد ہو کر چیختے۔۔۔ "لیکن سچ سچ ہے۔۔۔ ارسطو نے سچ کی خاطر زہر پیا۔۔۔ تم مجھے سچ بولنے سے روکتی ہو۔"

"مفتی جی اگر آپ ارسطو جیسا سچ بولیں تو میں کبھی اعتراض نہ کروں، آپ تو ایکٹرسوں کی طرح سچ بولتے ہیں۔ ایسے سچ سے شیخی کی بو آتی ہے۔ My love life جیسے سچ کی واقعی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ اس سے صرف سکینڈل پھیلتا ہے اور دوسری زندگیاں محروم و مجروح ہوتی ہیں۔"

"پھر پھیلے سکینڈل پھیلے۔۔۔ مجھے پرواہ نہیں۔۔۔"

مجھے جوش آ جاتا "لوگوں کو بیمار پا کر آپ انہیں ہومیو پیتھک پڑیاں پہنچاتے ہیں۔ ساری عمر چھولداریاں، شامیانے اور قناتیں استوار کرنے میں بسر ہوئی ہے۔ آپ کے خاکے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ کی دریا دلی اتنی ستر پوش ہے کہ سارے عیوب کو پھولوں کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ پھر اپنے پر یہ ظلم کیوں اپنے تنے سے وابستہ شاخوں کو یوں چھیلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر یہ تضاد کیوں؟

مفتی جی کی زندگی میں مجھے بالکل علم نہ تھا اور اب بھی کم کم مجھ پر یہ حقیقت کھلی ہے کہ تضاد ہی حضرت آدم کے ضمیر کا جزو اعظم ہے۔ جتنی بڑی شخصیت ہوگی اسی قدر بڑا اس کے اندر تضاد بھی رسہ کشی میں مبتلا ہوگا۔ بڑے ادیب، آرٹسٹ، کلاکار کے اندر کی یہ صلیبی جنگیں اسے کبھی قرار سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ یہی جنگ اس کے خون جگر کا باعث بنتا ہے اور اسی سے اس کے فن میں کمال کی چاشنی گھلتی ہے۔

شکر ہے میرے حصے تو ہمیشہ ان کی دریا دلی ہی آئی جس میں میرے تمام خس و خاشاک بہہ گئے لیکن اپنے لیے انہوں نے جوگیوں کی طرح کانٹے کا ایک فرش بنا رکھا تھا'

جس پر چلنے کی پریکٹس وہ صبح وشام کرتے تھے۔

ان سے میری آخری بحث سیب کے درخت پر ہوئی تھی۔

سن پچاسی کے شروع میں میری کوتاہی، کمزوری اور تساہل پسندی نے مجھ میں ایک خاص قسم کا فرار پیدا کر دیا تھا۔ میں نے پہلے ٹیلی ویژن کو خیر باد کہا پھر آہستہ لکھنے لکھانے سے مکمل انحراف اختیار کر لیا۔ مفتی جی سے میرا یہ ڈپریشن برداشت نہیں ہوتا تھا وہ مجھے کہتے:

"تو سیب کا درخت ہے۔۔۔ تجھے سیب ہی لگتے رہیں تو ٹھیک ہے تو کس وخت میں پڑ گئی ہے۔۔۔"

"مفتی جی۔۔۔ سیب کا درخت کبھی کبھی بانجھ بھی ہو جاتا ہے۔"

اگر کچھ سال بارش نہ ہو تو باغ سوکھ جاتے ہیں ، درختوں کی کیا مجال ہے؟ مفتی جی بھڑک اٹھتے۔ میں چپ رہتی "نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں ہے۔۔۔۔ تو کہیں گم ہو گئی ہے اور تو اپنا بنیادی کام نہیں کرنا چاہتی بیوقوف۔۔۔ ہم لوگ صرف لکھ سکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف لکھنے کے لیے آئے ہیں یہ سوچ کیا لکھنا ہے کیسے لکھنا ہے بس لکھ۔۔۔ باقی سارے کام اضافی ہیں۔"

میں انہیں بحث میں بہت دور لے جاتی۔ وہ جو کلے ٹھونکنے، رسیاں کھینچنے اور شامیانہ کھڑا کرنے کے ماہر تھے بحث میں ہار جاتے۔۔۔ ممتاز مفتی ساری عمر ہار ماننے والا نہ تھا۔ سر جھکا کر بیٹھ رہتا اور سمجھ نہ سکتا کہ اس کی وہ طاقت کہاں گئی جو لمحوں میں ہر بحث جیت جایا کرتی تھی۔

اس کاریگر کو علم نہ تھا کہ زندگی اسی طرح ناطاقتی پیدا کرتی ہے۔۔۔ پہلے انسان فنا سے ہارتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ مشن پر ہو تو بھی ہارتا ہے، ادھورا رہ جائے تو بھی شکست سے آشنا ہو جاتا ہے۔۔۔ بہادر انسان جو خوفزدہ بھی ہو اس کے ہار جانے کا منظر بھی عجیب ہے۔۔۔ شکستہ روسپاہی کارزار سے چلا تو جاتا ہے لیکن یہ منظر اس کے چاہنے والوں کو کبھی بھولتا نہیں۔۔۔ جانے والے نے اتنی جگہ آپ کے دل میں گھیری ہوتی ہے کہ مدتوں یہ خلا

بھرتا نہیں۔ دیر تک اس کے گرنے کی آواز آتی رہتی ہے۔۔۔ کبھی سائیں سائیں بن کر کبھی Echo کی طرح پھیلتی ہوئی۔ اسکے ذکر سے لوگ خالی نہیں ہوتے۔

-☆-

مظہر مفتی

بوُلی

ممتاز مفتی کے پڑ دادا پروفیسر مفتی میران بخش یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو امرتسر کالج سے ریٹائر ہوئے اور اگست ۱۹۰۰ء تک امرتسر سکول میں پڑھانے کے بعد جب بٹالہ آئے تو آبائی حویلی کے متصل اپنی رہائش کیلئے علیحدہ گھر بنوایا جبکہ حویلی میں انکی بہو، پوتا اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ کیونکہ ان کے بیٹے مفتی مولا بخش کا انتقال ۲۳ دسمبر ۱۸۷۸ء کو ہو چکا تھا۔ تین منزلہ "نیا گھر" ستمبر سے دسمبر ۱۹۰۰ء میں مکمل ہوا اور اس پر ایک ہزار پانچ سو ستاسی روپے بارہ آنے خرچ آیا۔ اُن دنوں معمار اور بڑھئی کی اُجرت آٹھ آنے یومیہ اور مزدور کی چار آنے یومیہ تھی۔ خشت پختہ کی قیمت سات روپے آٹھ آنے فی ہزار تھی۔ وہ سترہ نومبر ۱۹۰۴ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

اس گھر میں مفتی محمد حسین اور صغریٰ بیگم کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش کے دو سال نو ماہ ستائیس دن بعد صبح نو بجے بروز سوموار گیارہ رجب ۱۳۱۳ھ بمطابق گیارہ نومبر ۱۹۰۵ء ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نومولود کی نانی گلاب بیگم عرف گلابی نے نام مقبول حسین رکھا اور اس کی مناسبت سے اس کی دادی اور والدہ اسے بوُلی پکارنے لگے۔ والد نے اپنی ڈائریوں میں اسکا تذکرہ آخر تک مقبول اور بوُلی نام سے ہی کیا ہے۔ گرچہ بچے کا نام بعد میں ممتاز حسین بدل دیا گیا۔ اس بچے نے بعد میں ممتاز مفتی کے نام سے ادیب کی حیثیت سے شہرت پائی حتیٰ کہ ستائیس اکتوبر ۱۹۹۵ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

جس وقت عالمِ ارواح میں پہنچا ہوگا تو اس کے والد نے اسکا استقبال کرتے ہوئے کہا ہوگا، "ارے بوُلی! تو بھی آگیا آخر، ہاہا۔" اس لئے ہم آج اسے اسی نام سے یاد کرتے

ہیں۔ آخر "علی پور کا ایلی" سوانح حیات میں ایلی نام بُولی نام کی مناسبت اور وزن پر ہی رکھا گیا تھا۔

بُولی کے والد مفتی محمد حسین خاندان میں ماسٹر کہلاتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز یکم مئی ۱۹۰۱ء کو پھلور میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کیا اور پندرہ اگست ۱۹۳۵ء ریٹائرمنٹ تک محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے۔ بُولی کی دادی محلہ میں سب کی "ماں" تھی اور والدہ صغریٰ بیگم بھگت بھابھی تھی اور محلہ سے باہر سب انہیں استانی جی کہتے۔ بُولی اپنی دادی کا چہیتا تھا اور آنکھ کا تارا۔

ابھی بُولی ایک سال کا نہ ہوا تھا کہ ماسٹر صاحب نے سیالکوٹ میں دو اگست ۱۹۰۶ء کو عائشہ بیگم دختر غلام محمد رنگ پورہ سیالکوٹ سے دوسری شادی رچالی اور بُولی کی ماں گھر میں "کامن" کی حیثیت اختیار کر گئی اور اس نے اپنی سوکن عائشہ بیگم کی خدمت اور خوشنودی کو اپنا شعار بنالیا جس سے بُولی اور اس کی بہن ماں کی شفقت سے اکثر محروم رہے۔

اکتوبر ۱۹۰۷ء میں بُولی سخت بیمار پڑا۔ پیچش، تپ اور اسہال نے اسے تنکے کی طرح کر دیا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی، مگر علاج معالجہ اور ماں کی تیمار داری نے صحت آوری کی۔ ان دنوں عائشہ بیگم گورداسپور تھی، جہاں ماسٹر صاحب اسکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے۔ اس لئے ماں کو تیمار داری کی فرصت مل گئی۔ کون جانتا ہے کہ اگر ان دنوں عائشہ بیگم بٹالہ ہوتی تو بُولی ماں کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اللہ کو پیارا ہو گیا ہوتا اور اردو ادب محرومیت کا شکار ہو گیا ہوتا۔

بُولی ہمیشہ بڑی بہن کے پاس رہتا اور اس نے بُولی کو پڑھانا شروع کر دیا، کیونکہ گھر میں ان دو بچوں نے علیحدہ دنیا آباد کر رکھی تھی۔ بُولی کو ماسٹر صاحب نے سولہ جون ۱۹۱۳ء کو ہال گیٹ برانچ اسکول امرتسر میں جماعت سوئم میں پہلی دفعہ داخل کروایا۔ ان دنوں وہ امرتسر میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ وہ ماسٹر صاحب کے ساتھ انبالہ، لدھیانہ، رہتک، میانوالی، حصار اور ڈیرہ غازی خاں میں رہا اور مارچ ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں ۳۲۹ نمبر حاصل کر کے پاس کر لیا۔ عائشہ بیگم کا انتقال ۹ جون

۱۹۱۸ء کو ہو گیا تھا اور ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ماسٹر صاحب نے تیسری شادی سیالکوٹ میں امیر بیگم سے رچالی تھی، جسے صفائی کا احساس نہ تھا۔ وہ اپنی گوری رنگت پر ہی نازاں تھی بوُلی کو اس تیسری ماں سے گھن آتی۔

مئی ۱۹۲۱ء میں بوُلی اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا مگر بوجہ غیر حاضری دس ماہ میں نام کٹ گیا۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں پھر داخلہ لیا مگر پھر تین ماہ میں ہی نام کٹ گیا۔ اب ماسٹر صاحب خود لاہور آئے اور جون ۱۹۲۲ء میں کالج میں تیسری بار داخلہ کروایا۔ وہاں سے بی ڈی کالج انبالہ تبادلہ کروایا جہاں وہ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بوُلی ۱۹۲۴ء میں انٹر میڈیٹ کے امتحان میں انگریزی کے پرچے میں فیل ہوا گو فارسی، فلسفہ، تاریخ اور اردو میں پاس تھا مگر کل نمبر کمپارٹمنٹ کے نہ تھے۔ بوُلی کی اس دفعہ کی ناکامی کی وجہ شاید یہ ہو کہ چوبیس جون سے امتحان شروع تھا مگر اس کے آبا ماسٹر صاحب نے بارہ اپریل ۱۹۲۴ء کو یعنی بوُلی کے امتحان سے تقریباً ڈھائی ماہ قبل چوتھی شادی جنت بی بی عرف کوڑی سے کر لی تھی اور گھر میں ایک ساڑھے پانچ سالہ پچھولک مشتاق احمد عرف چگا بھی لے آئی تھی۔ اس پر بوُلی کی پراگندہ خاطری لازم تھی۔ اگلے سال وہ بیماری کی وجہ سے امتحان نہ دے سکا اور ہندو مہاسبھا کالج امرتسر اور اس کے ہاسٹل میں داخلہ لیا کیونکہ ماسٹر صاحب کا تبادلہ انبالہ سے لدھیانہ ہو گیا تھا اور بوُلی کے سر عشق کے بھوت سوار ہو چکے تھے خیر اس نے ۱۹۲۶ء میں انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۸ء میں اسے حاضریاں پوری نہ ہونے کی وجہ سے امتحان میں شمولیت کی اجازت نہ ملی آخر نومبر ۱۹۲۹ء میں میٹرک کرنے کے آٹھ سال بعد اس نے بی اے کا امتحان دیا۔ دسمبر میں نتیجہ نکلا تو وہ ۲۰۷ نمبر لے کر پاس تھا۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ گورداس پور ضلع میں کچھ زرعی اصلاحات کے تحت سید ہاشمی اور قریشی قبائل کو غیر کاشتکار قرار دیا گیا۔ اس پر اپنی زرعی زمینوں کی حفاظت کی خاطر ماسٹر صاحب کے ہم زُلف مفتی محمد شفیع نے تبدیلی ذات کیلیے عرضی دی اور ڈپٹی کمشنر گورداسپور نے پندرہ جنوری ۱۹۱۹ء کو ان کے افسر کمانڈنگ ۳۷ لانسرز کوہاٹ کو مطلع کیا

کہ عرضی دہندہ کی ذات قریشی سے راجپوت سرکاری کاغذات میں بدل دی گئی ہے۔ تیرہ جنوری ۱۹۲۲ء کو ماسٹر صاحب نے بھی تبدیلی ذات کیلئے عرضی دی اور تیرہ ستمبر ۱۹۲۲ء کو عدالت مال ڈپٹی کمشنر گورداسپور نے ذات نارو (راجپوت) کا حکم سنا دیا۔ اس طرح بوٗلی ہاشمی قریشی کی بجائے نارو راجپوت ہو گیا گرچہ سید عبدالمجید امجد بخاری بٹالوی نے اپنی کتاب ''یادِ ایام'' (بٹالہ اور مشاہیر بٹالہ کی مختصر تاریخ) اشاعت جنوری ۱۹۶۹ء میں لکھا ہے کہ بٹالہ کا مفتی خاندان نسبتاً سادات ہاشمی ہے۔ ماسٹر صاحب کے دوسرے ہم زلف مفتی محمد حسن، بہنوئی مفتی ظہور الحسن، داماد مفتی مظفر حسین اور بوٗلی کے ماموں مفتی مبارک علی نے ذات کی تبدیلی پر ان کا ساتھ نہ دیا۔ بعد میں خان بہادر شیخ احمد قریشی وکیل گورداسپور کی اپیل پر وہ ضلعی زرعی اصلاحات منسوخ قرار دی گئیں۔ خان بہادر شیخ احمد ماسٹر صاحب کے خالو امام الدین قریشی کے قریبی عزیز تھے۔

جب بوٗلی نے بی اے پاس کیا تو ملازمت کا فقدان تھا۔ اس لئے اس نے ۱۹۳۰ء میں سلون شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کا کورس بٹالہ میں شروع کیا اور ساتھ سلطان سے معاشقہ زور پکڑتا گیا۔ اس نفسیات کے طالب علم نے اپنی نظریاتی قدروں کا تختۂ مشق مجھے بنایا۔ میں اس وقت پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُدھر فیاض محمود نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف محمود پر طبع آزمائی شروع کی جو میرا دوست تھا اور میرے ہی اسکول میں چھٹی جماعت میں تھا۔ وہی یوسف محمود جس نے دوسری شادی میڈم آزوری سے کی۔ بوٗلی میرے ساتھ شمیم قادری (جو بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے) کو سہ پہر کے وقت پڑھاتا۔ ہمیں دیکھ بوٗلی کی چوتھی ماں کوڑی نے اپنے پچھلکو بیٹے مشتاق چگا کو ساتھ پڑھنے بٹھا دیا۔ بوٗلی سخت گیر استاد تھا۔ شمیم کا وہ لحاظ کرتا کیونکہ بوٗلی کی ماں شمیم کی پھوپھیوں کی سہیلی اور مرید تھی اور شمیم سید نوبہار شاہ قادری کا بڑا بیٹا ہونے کے ناطے پیر گدی کا اگلا وارث تھا۔ چگے کو وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا ورنہ اس کی ماں شیرنی کی طرح بوٗلی کے سر آجاتی۔ اس لئے میں بیچارہ ہی اس کی زد میں رہ گیا تھا گرچہ میں اس کے اور اس کی معشوقہ سلطان کے درمیان پیغام رساں تھا۔ اس نفسیاتی نظریات کی طبع آزمائی نے یوسف محمود اور مجھے زندگی میں نارمل پٹڑی سے

ڈی ریل (derail) کر کے رکھ دیا، گو ہم دونوں کے راستے مختلف سمت چلے۔

بُو لی کو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ایس اے وی کلاس میں داخلہ مل گیا اور جولائی ۱۹۳۲ء میں اس نے چھ سو تین نمبر پا کر ایس اے وی کا ڈپلوما حاصل کر لیا۔ تیئس ستمبر ۱۹۳۲ء کو اسے گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال میں عارضی انگلش ٹیچر کی حیثیت سے تین ماہ کیلئے پہلی ملازمت ملی پھر گورنمنٹ مڈل اسکول دھرمسالہ میں تین مئی ۱۹۳۳ء سے اٹھارہ جولائی ۱۹۳۳ء تک دوسری ملازمت اور سات نومبر ۱۹۳۳ء کو ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول گوجرہ میں با قاعدہ ایس اے وی گریڈ میں انگریزی کا استاد مقرر ہوا۔

گوجرہ میں بُو لی نے مہدی آباد محلّہ میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اس محلہ میں اس کا ہیڈ ماسٹر اور کئی دوسرے استاد رہتے تھے اور وہ مجھے ساتھ لے گیا۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا۔ کچھ عرصے بعد جہلم کے پاس لنگر پور کا قمر الدین، جو ڈاکخانہ میں کلرک تھا بُو لی کے دوست ٹیلی فون آپریٹر نندہ کی معرفت اسی مکان میں آ گیا اگلے سال وہ اپنے بھائی مظفر الدین کو لے آیا جو مجھ سے چھ ماہ چھوٹا تھا مگر دو جماعت پیچھے تھا۔ مظفر عرف ظفر شرارت کا مجسمہ تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں کامی لڑکیوں سے عشق کی داستانیں سناتا اور وہ لڑکیاں بھرے کھیتوں میں اور ٹیلوں کی اوٹ میں لٹ کر چودھری کے بیٹے کی شکایت کی تاب نہ لا سکتیں۔

جلد ہی یہ گھر مبارک اسماعیل ہیڈ ماسٹر کے خلاف محاذ کا اڈا بن گیا۔ سازشیں ہوتیں۔ گمنام خطوط افسران کے نام ٹائپ کر کے بھیجے جاتے۔ ہم نظریہ استاد اور احباب جمع ہوتے۔ ایسے میں مَیں کتابیں سمیٹ بیٹھک میں پناہ ڈھونڈتا۔ کبھی کبھی سلطان محمود جو بعد میں محمود ہاشمی بن گیا، ''کشمیر اداس ہے'' کا مصنف آ جاتا اور سکول لائبریری کی اردو کتب کا ذکر کرتا۔ اس نے تقریباً دو تہائی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ظفر کی کہانیوں نے مجھ میں جنس اور محمود کی باتوں نے تعلیمی احساس کمتری کو جنم دیدیا۔ احساسِ کمتری ایک ایسا روگ ہے کہ اگر لگ جائے تو جسم اور روح کو زنگ کی طرح کھا جاتا ہے۔

ایک روز میں بازار گیا تو ایک ریشمی رومال خریدا، نیلے رنگ کا ریشمی کپڑا اور اس پر

سرخ رنگ کا پھول کڑھا ہوا تھا۔ ظفر نے دیکھا تو میں نے بڑ ماری کہ کسی نے تحفہ دیا ہے۔ ظفر بات کو بتنگڑ بنانے کا استاد تھا۔ جب بُو لی اور اس کے احباب اپنی سکیم میں منہمک تھے تو ظفر میرا رومال لیئے وہاں پہنچا اور بولا کہ معلوم ہے کہ مبارک اسماعیل کی بیٹی مبارکہ نے یہ رومال اپنے ہاتھ سے کاڑھ کر میرے دوست کو دیا ہے آج ہی۔ اس پر سب حاضرین کا چہرہ اتر گیا کہ گھر کے بھیدی سے اگر مبارکہ تک ان کی باتیں پہنچ گئیں تو ان کی خیر نہیں کیونکہ بیٹی سب باتیں باپ کو بتلا دے گی۔ اگلے روز سکول پہنچتے ہی میں نے ظفر کی شرارت کا قصہ محمود کو بتایا۔ باتیں کرتے ہمیں اسکول اسمبلی کی گھنٹی کا جب ہوش آیا تو اسمبلی میں حاضری ناموزوں تھی۔ اس لئے ہم باغیچے میں ٹہلنے لگے اور سوچتے رہے کہ ظفر کی شرارت کا ہم پر کیا اثر پڑسکتا ہے اور اسے آئندہ کیسے لگام لگائی جائے؟ ادھر بُو لی نے محمود اور مجھے اسمبلی میں غیر حاضر پایا مگر خاموشی سے لوٹ گیا۔ کلاس شروع ہوئی تو میرا پہلا پیریڈ انگریزی کا تھا اور بُو لی استاد۔ اس نے کلاس میں آتے ہی حاضری لینے کی بجائے مجھے آگے بلایا اور بید اُٹھا ساری جماعت کے سامنے میرے ہاتھوں پر وہ بارش کی کہ میری ہتھیلیاں ہفتہ بھر سوجی رہیں۔ سکول میں بُو لی اور بید لازم و ملزوم تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ بُو لی کی اولین کہانیاں "جھکی جھکی آنکھیں" اور "آپا" وغیرہ ادبی دنیا، اور ساقی رسالوں میں چھپیں اور اس کا نام پیدا کر گئیں۔ ان کہانیوں پر اس وقت تبصرہ ہوا کہ یہ فرائڈ کی Case Histories کی اردو میں Adaptions ہیں۔ انہی دنوں فلسفہ، نفسیات اور جنسیات وغیرہ کی کتابیں، چار عدد ہر ماہ دیال سنگھ لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری لاہور سے باقاعدہ آجاتیں۔ فرائڈ، ہیوی لاک ایلس، برٹرینڈ رسل اور ہکسلے ان میں نمایاں مصنف تھے۔

انگریزی زبان کے Romantist شاعر مثلاً کیٹس، (Keats)، شیلے، (Shelley)، (Byron) اور وڈز ورتھ (Words Worth) اس کے محبوب شاعر تھے اور ان کا کام اس کی میز کی زینت۔ ان میں سے چار نسخے ابھی تلک میرے پاس محفوظ ہیں۔ کلاسیکل آرٹسٹ اور پینٹرز کی پینٹنگز جن میں اکثر Nudes تھیں اس کا سرمایہ۔ ایک تصویر اس کی چارپائی کے ساتھ رہتی جو سلطان کی Beige Coloured فوٹو گراف تھی۔ جسے فوٹو فریم میں

آنکھوں کے سوا سب چھپا رکھا تھا ایسا لگتا یہ آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ان میں شوخی، چمک اور مسکراہٹ کی جھلک تھی۔

فرش پر ٹائپ رائٹر اور ہارمونیم ہوتے۔میرے خیال میں یہ بُولی کا formative period تھا جو ۱۹۳۷ء تک چلا اور یہ ری ایکشن تھا اسلامیہ کالج میں فیاض محمود کے pin pricks کا۔پھر تقریباً پانچ سال وہ معاشی بدحالی کا شکار رہا، جسے میں stritity period کہتا ہوں۔

مبارک اسماعیل کے خلاف محاذ کی تفتیش کے نتیجہ میں بُولی کا تبادلہ اٹھائیس جون ۱۹۳۵ء کو چک جھمرہ ہو گیا۔برسرِ تذکرہ، ایس ایم شریف انسپکٹر سکولز ملتان نے تفتیش کے درمیان کہا ''میں یہاں جسٹس کرنے نہیں ایڈمنسٹریشن کرنے آیا ہوں، یہ اُس زمانے کا سرکاری نظریہ تھا۔جھمرہ میں اس نے تین جولائی کو چارج لیا۔میں ساتھ تھا اور وہاں سے میں نے میٹرک کیا۔اگلے سال جولائی ۱۹۳۶ء میں اسے گورنمنٹ کی ملازمت مل گئی اور چار تاریخ کو اس نے جام پور ہائی سکول میں چارج سنبھالا، مگر ایس اے وی کی بجائے جے اے وی گریڈ میں۔ان دنوں ایس اے وی گریڈ اسی سے سو روپے ماہانہ اور چار روپے سالانہ ترقی تھا جبکہ جے اے وی گریڈ پچپن سے ستر روپے ماہانہ اور تین روپے سالانہ ترقی تھا۔چار ماہ بعد اس کا تبادلہ منٹگمری (حالیہ ساہیوال) ہو گیا اور چھ جولائی ۱۹۳۷ء کو وہ جے اے وی گریڈ میں مستقل ہو گیا۔

یہ ۱۹۳۶ء کا آخر تھا کہ بُولی اور سلطان نے فرار کا فیصلہ کر لیا اور اس سے پہلے سہرا بندی اور برات کی خواہش کا بُولی کو ستائیس دسمبر ۱۹۳۶ء کو موقع مل گیا۔اس روز اس کے ماموں زاد بھائی ڈاکٹر امانت علی مفتی کی شادی تھی۔بُولی سے ڈاکٹر آٹھ سال چھوٹا تھا۔دولہا اور شہ بالا سہرے لگا کر ایک گھوڑے پر بیٹھے۔جب برات بٹالہ شہر کے بازاروں میں جا رہی تھی گلی کوچوں میں مکانوں کی چھتوں اور بالکنیوں میں کھڑی عورتیں ایک دوسری سے کہہ رہی تھیں، ''بہن! دیکھا دو شادیاں ہیں۔مگر دونوں دولہا ایک گھوڑے پر سوار ہیں۔بیچاروں کو دوسرا گھوڑا لینے کی توفیق نہیں ہوئی۔'' کوئی کہہ رہی تھی ''اری دیکھو تو! بڑا دولہا پیچھے بیٹھا

ہوا ہے اور چھوٹا آگے، مفتیوں کو کیا ہو گیا ہے کہ عمر کا لحاظ ہی اُٹھ گیا۔ یہ وہی خاندان ہے جو اس سارا علاقہ میں کبھی آدابِ محفل میں یکتا تھا۔'' ایک بولی، ''یہ قیامت کے آثار ہیں اور کیا۔'' بُو لی نے سہرا لگا لیا تھا۔ گھوڑے پر بیٹھ لیا تھا۔ باجے کے ہمراہ بارات چڑھ چکی تھی۔ اس لئے انتظامات مکمل کر، بارہ نومبر ۱۹۳۷ء کو وہ سلطان اور اس کے چھ بچوں کو لے کر پہلے امرتسر پھر منٹگمری چلا گیا۔ منٹگمری سے اس کا تبادلہ باغبانپورہ اسکول میں ہوا اور وہ مصری شاہ میں رہا پھر تبادلہ قصور ہو گیا۔ یہاں ۱۹۴۳ء میں اس کی سلطان سے ان بن ہوئی اور وہ اکیلا سانگلہ ہل شیخوپورہ اور گورداسپور رہا۔ ۱۹۴۵ء میں اماں کے اصرار پر دوسری شادی کی۔ اگلے سال ۱۹۴۶ء میں والد کے ایک طعنے پر نو سالہ مستقل ملازمت پر لات مار لاہور ریڈیو اسٹیشن میں ایک سالہ معاہدہ پر سٹاف آرٹسٹ (سکرپٹ رائٹنگ) لگا۔ سال بعد احمد بشیر کے ہمراہ بمبئی گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے شروع میں واپس آیا شاید اللہ کو منظور تھا کہ وہ بٹالہ سے اپنے قریبی عزیزگان کو لاہور لے آئے جن میں بہت سے لاہور کے فسادات سے بچنے کیلئے بٹالہ کو امن کا گہوارہ اور پاکستان کا حصہ سمجھ کر وہاں چلے گئے تھے۔ ریفیوجی کیمپ میں کرنل مجید ملک کے تحت ملازمت کی اور پھر اپنے پرانے دوست فیاض محمود کے تحت ائیر فورس میں، مگر نہ نبھی۔ وہاں بُو لی نے وہ محاذ قائم کیا کہ محکمہ کارزار بن گیا۔ یہاں سے ۱۹۴۸ء کے آخر میں آزاد کشمیر ریڈیو میں کوہ مری رہا پھر آزاد کشمیر پبلسٹی میں ڈلہوزی روڈ راولپنڈی چھاونی میں، یہاں ڈائریکٹر ضیاء الاسلام سے جھگڑا ہوا۔ بُو لی کا اپنے افسران سے جھگڑوں کا آپ تجزیہ کریں تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ باس ایک Father figure head ہے۔ بُو لی کی اپنے باپ سے کشمکش کا پرتو باس سے تعلقات پر منعکس ہوتا رہا۔ اس میں حفیظ جالندھری اور قدرت اللہ شہاب مستثنیٰ تھے اس لئے کہ حفیظ جالندھری باس نہ بن سکا اور قدرت اللہ شہاب کو بُو لی نے پیر و مرشد بنا لیا۔

یہ ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے۔ شاید اگست کا مہینہ تھا کہ فری میسن کلب (Lodge Light in the Mimalayas No.1448 EC) راولپنڈی میں داخلہ کیلئے بُو لی لاج روم کے باہر لیفٹیننٹ کرنل ٹی ایم پی مور عرف پونی کے ہمراہ منتظر تھا کہ اندر آرمی سگنل آفیسرز نے

اسے بلیک بال کر دیا کیونکہ امیدوار کے بارے میں تفتیش میں ضیاء الاسلام نے بوٗلی کے بارے میں زہر اُگلا تھا۔ اس طرح وہ فری میسن بن جانے سے بال بال بچ گیا۔ بعد میں اسے پھر داخلے کی دعوت دی گئی مگر اس کی انا نے اجازت نہ دی کہ راندہ درگاہ پھر بسجود درگاہ ہو۔ اس واقعہ کا ذکر اس نے قدرت اللہ شہاب کے سوا کسی سے نہ کیا۔ شہاب بولے ''مفتی جی! شاید یہی اللہ کی رضا تھی۔''

میں ویلیج ایڈ محکمے سے ایوانِ صدر پہنچا اور راولپنڈی سے کراچی ۱۹۶۰ء میں قدرت اللہ شہاب کے ہمراہ واپس راولپنڈی آ گیا۔ اگلے سال داستان گو پبلشر یعنی اشفاق احمد خان نے بوٗلی کا ناول ''علی پور کا ایلی'' چھاپا اور اسے پڑھنے کے بعد میں نے خاندان میں ان واقعات کی سچائی کی تصدیق کی کیونکہ مجھ سے بہتر کسی نے بوٗلی کا وہ زمانہ نہ دیکھا تھا۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں مَیں نے وہ لسٹ مکمل کر لی جس میں کتابی اور اصلی نام ہیں، یہی لسٹ ''علی پور کا ایلی'' کی نئی اشاعت میں شامل ہے۔

بوٗلی کے بارے میں لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، کیونکہ اس نے اپنا کچھا چٹھا اپنی سرگذشت میں بے کم و کاست بڑی دیدہ دلیری سے لکھ دیا اور اس کے ادبی پاروں پر ناقدین کی کرم فرمائی سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ مضمون شاید چند تاریخوں کا تعین کر سکے میں چلتے چلتے، میرے نام ان کے خط مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۸۸ء میں سے وہ اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں انہوں نے خود اپنا تجزیہ کیا ہے۔

لکھتے ہیں ''لوگ مجھ میں کئی ایک کمزوریاں دیکھتے ہیں لیکن کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں منافقت کا سزاوار ہوں۔ اُلٹا لوگ کہتے ہیں تم ضرورت سے زیادہ کہہ دیتے ہو۔ بڑ بولے ہو۔ میرے جاننے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو مجھ سے جھجکے بغیر بات کہہ دیتے ہیں۔''

آگے لکھتے ہیں ''میری شخصیت میں بہت کمزوریاں ہیں، غصہ ہے، شدت ہے، میانہ روی نہیں، ذہن سیکسی ہے، کنجوس ہوں، جذباتی ہوں، منتظم نہیں، ذہنی آوارگی ہے Self sufficient ہوں، انٹروورٹ ہوں۔ اور ایک بات تو یقینی ہے کہ میں شدت سے سیلف

کانشس ہوں۔ اپنے عیب مجھے دکھتے ہیں اگرچہ انہیں دور کرنے کی طاقت سے محروم ہوں۔ چونکہ بے عمل ہوں۔ پاکیزہ نہیں ہوں، نہ جسمانی نہ ذہنی، بہرحال میرا خیال ہے کہ منافق نہیں ہوں۔"

لوگ کہتے ہیں کہ ایسے مضمون کا خاتمہ دعا پر ہوتا ہے مگر "علی پور کا ایلی" تو قدرت اللہ شہاب کی معیت میں "الکھ نگری" میں براجمان ہوگا اسے ہماری دعا کی ضرورت کیا؟

-☆-

مفتی جی۔ کچھ یادیں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب لبیک تازہ تازہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی تھی۔ محشر رسول نگری کوئٹہ سے اسلام آباد تشریف لائے۔ ہمیں پتہ چلا تو انہیں ملنے کیلئے ہم سب ان کی قیام گاہ پر گئے۔ پہلی بات جو انہوں نے ہم سب سے کی، مفتی کو لے کر آؤ۔ ہم لوگ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے اور مفتی جی کو لے کر پھر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلام دعا کے بعد محشر صاحب مفتی جی سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ ''مفتی جی! آپ نے تو ہمارے دل کی بات پکڑ لی ہے۔ ہم نے بھی آپ ہی کی طرح سمندر سے دل لگا رکھا ہے۔ اب نہ کوئی ہماری منزل ہے اور نہ ہی کوئی سمت۔ کوئی موج ہمیں اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیتی ہے اور کوئی دوسری طرف۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ''لبیک'' نکالی جو کہ ایک جگہ سے دوہری مڑی ہوئی تھی، اور وہاں سے مفتی جی کو پڑھ کر سنانی شروع کر دی۔ یہ وہ سمندر اور محبت کی روداد تھی۔ اسی کیفیت میں انہوں نے مفتی جی کو کہا کہ ''مفتی آج سے تیرا ورد گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر'' ہوگا۔ اب تُو جا اور مارگلہ پر جا بیٹھ۔ دنیا خود بخود تیرے پیچھے پھرے گی۔ مفتی جی وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھے کہ حکم ہوا کہ سکھر میں قاضی صاحب کا عرس ہے آپ سب لوگ وہاں پہنچو۔

واپس گھر پہنچے تو مفتی جی سخت پریشان تھے۔ کہنے لگے، ''یارو مجھے بچاؤ، میں نے وردی ہرگز نہیں پہننی، میں تو باہر بیٹھ کر تماشہ دیکھنے والوں میں سے ہوں۔ میں تو ایک کوکر ہوں، میں گل نہیں سکتا۔'' اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ پیارے وردی ہرگز نہیں پہننا۔ دور ہی سے نظارہ لو، اسی میں مزا ہے۔

قاضی عبدالخالق صاحب محشر صاحب کے پیرو مرشد تھے۔ وہ زندگی بھر مجذوبیت کے عالم میں رہے۔ اپنی سفید لمبی ڈاڑھی کے ساتھ وہ اپنے تکیے میں ننگ دھڑنگ پڑے رہتے اور دنیا کا ایک ہجوم ان کے گرد رہتا۔ کوئی ان کے منہ میں مٹھائی ٹھونس رہا ہوتا، کوئی کھانے کی کوئی اور چیز۔ یہ چیزیں ان کے منہ سے خود ہی باہر نکل جاتیں اور انہیں کوئی خبر نہ ہوتی۔ محشر صاحب کی آمد ہوتی تو فوراً ہوش میں آ جاتے۔ خدام سے بولتے، میرے کپڑے لاؤ وہ بد بخت محشر آ رہا ہے اور پھر جب تک محشر صاحب کا قیام ان کے پاس رہتا وہ پورے ہوش میں رہتے۔ ان کے انتقال کے بعد وہیں تکیے میں ان کا مزار بنا دیا گیا۔

الغرض حکم کی تعمیل میں ہم لوگ مفتی جی کو ساتھ لے کر ریل گاڑی میں بیٹھے اور سکھر پہنچ گئے۔ محشر صاحب وہاں پر پہلے ہی سے موجود تھے۔ مفتی جی کو پکڑ کر قاضی صاحب کے مزار پر لے گئے اور مزار سے چادر اُٹھا کر مفتی جی کا سر اس میں گھسا دیا۔ مفتی جی چادر سے باہر نکلے تو اُن کی حالت غیر تھی۔ اسلام آباد واپس بھاگے اور شہاب صاحب سے کہنے لگے کہ مجھے بچاؤ، ورنہ میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ شہاب صاحب بھی کافی پریشان ہوئے کہ مفتی کہاں پھنس گیا ہے، بہر حال انہوں نے کسی طرح مفتی جی کی خلاصی کرا دی۔

گو بظاہر تو مفتی جی وردی پہننے سے بہت گھبراتے تھے لیکن درحقیقت ان کے اندر ایک مجذوب یقیناً چھپا بیٹھا تھا۔ انہیں دنیا کی کوئی حرص و ہوا نہیں تھی۔ اپنے تکیے میں بیٹھے خلقِ خدا کی دلجوئی کرتے رہتے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو خود پریشان ہو جاتے اور ہر طرح سے دوسروں کے دُکھ درد کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک دفعہ ایک خاتون کسی بیماری کیلئے اُن سے ہومیو پیتھک دوائی لینے آئی۔ باتوں باتوں میں اس کی مالی زبوں حالی کا قصہ چل نکلا۔ مفتی جی پریشان ہو گئے۔ نہ صرف اس وقت اسے مالی پریشانی سے نکالا، بلکہ کئی ماہ تک اپنی تنگ دستی کے باوجود ان کے خرچ کا بندوبست کرتے رہے۔ ایک نوخیز ادیب نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔ سخت پریشان تھا۔ مفتی جی کو پتہ چلا تو لٹھ لے کر عکسی مفتی کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کی نوکری کا بندوبست کرو۔ اور جب تک یہ کام ہو نہ گیا اس کی جان نہیں چھوڑی۔

ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا گھر مرجع خلائق تھا۔ ہر ملنے والے کا دل ایک جملے سے موہ لیتے، مثلاً جب بھی پرتو روہیلہ آتے اُن سے کہتے کہ یار تم بہت حسین ہو، میں تو تمہارا عاشق ہوں۔ ایک دفعہ ایک خاتون سے کہنے لگے کہ تُو کیا کھاتی ہے روز بروز جوان ہوتی جاتی ہے۔ وہ بیچاری اس قدر شرمائی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور اسے موچ آ گئی۔ لیکن وہ پھر بھی مسکراتی رہی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر جمیل جالبی ہسپتال میں ان کی تیمارداری کیلئے آئے۔ ان کو تازہ تازہ ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔ کہنے لگے "یہ حکومت کو کیا ہو گیا ہے، یہ ستارہ تو ہم جیسے چھوٹے لوگوں کیلئے ہوتا ہے، تمہیں تو کوئی بڑی چیز ملنی چاہیے تھی۔"

بعض دفعہ کوئی بہت بڑی بات اس طرح کہہ جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک دفعہ ایک میزبان خاتون سے کہنے لگے کہ تُو اتنے بدصورت خاوند کے ساتھ کس طرح گزارہ کرتی ہے۔ وہ بیچاری جواب میں صرف مسکرادی۔ ان کی بات میں اتنی اپنائیت ہوتی کہ کوئی برا نہ مانتا۔ لوگوں کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کی کسی بات پر ناراض نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ شام کے وقت ہم لوگ ان کے گھر پر بیٹھے ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی ان سے ملنے آئی۔ دروازے پر ہی سے اسے کہنے لگے کہ تُو کس وقت آ گئی اب تو یہ لوگ میرے پاس بیٹھے ہیں پھر کسی وقت آ جانا۔ پتہ چلا کہ وہ پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق ان سے ملنے کیلئے واہ سے آئی ہے۔ ہمیں انتہائی حیرت ہوئی جب وہ بلا چون چرا اُلٹے پاؤں واپس مڑ گئی۔ میں نے مفتی جی سے احتجاج کیا کہ آپ بھی حد کرتے ہیں وہ اس وقت اکیلی کیسے واپس جائے گی۔ آپ تکلفاً ہی اسے روک لیتے۔ کہنے لگے۔ تم لوگوں کی وجہ سے پریشان ہو جاتی۔ کوئی بات نہیں کسی اور وقت آ جائے گی۔

مفتی جی کی مقبولیت خواتین میں کہیں زیادہ تھی۔ ایک معروف خاتون ادیبہ نے مفتی جی پر ایک دفعہ دائرہ میں مضمون پڑھتے ہوئے بتایا کہ جس زمانے میں وہ ہوسٹل میں رہتیں تھیں تو لڑکیوں کو مفتی جی کے افسانوں کا بہت انتظار رہتا۔ جب بھی کوئی افسانہ چھپتا تو ہوسٹل میں کئی دن تک کھسر پھسر رہتی۔

مفتی جی ایک اچھے مصنف تو تھے۔ لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی سے ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ کبھی تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیتے اور اپنے نقطۂ نظر کا برملا اظہار کرتے۔ اگر کسی کے خلاف کوئی بات بھی کرتے تو اس میں ہرگز nahce نہیں ہوتا۔ دوستوں کے بارے میں بہت حسنِ ظن رکھتے۔ دل سے ان کی تعریف کرتے اور اس میں مبالغہ آمیزی کرنے میں بھی گریز نہ کرتے۔

مفتی جی سے میں غالباً ۱۹۳۸ء میں پہلی بار اس وقت متعارف ہوا جب کہ ان کا ایک افسانہ ''سونے میں پیلی'' ادبی دنیا کے سالنامے میں مَیں نے پڑھا۔ اس پر انہیں دیگر مصنفین کے ساتھ ساتھ دس روپے کا انعام بھی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ان کے افسانوں کے چھپنے کا بہت انتظار رہتا۔ ان کا افسانہ ''آپا'' ایک شاہکار افسانہ تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ مفتی صاحب اس افسانے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ افسانہ میں نے کسی دوست کی فرمائش پر قلم برداشتہ لکھ دیا تھا۔ ہاں میرا بہترین افسانہ ''سمے کا بندھن'' ہے۔ میرے خیال میں یہ افسانہ بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن ''آپا'' اس سے کہیں زیادہ بڑا افسانہ ہے۔

مفتی جی سے میری بالمشافہ ملاقات ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ جب محمود نظامی صاحب کا بحیثیت سٹیشن ڈائریکٹر آزاد کشمیر ریڈیو میں تقرر ہوا اور وہ سکرپٹ رائٹروں کی ایک کھیپ کو ساتھ لے کر تراڑکھل تشریف لائے۔ مفتی جی کے ساتھ یوسف ظفر اور اشفاق احمد بھی تھے۔ اس زمانے میں ان تینوں کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ بعد میں مفتی جی اور یوسف ظفر میں اَن بن ہوگئی لیکن اشفاق صاحب اور مفتی جی کی دوستی اُن کی حیات تک قائم رہی۔ اشفاق صاحب سے مفتی جی کو ایک بہت بڑی شکایت تھی۔ ان کے خیال میں اشفاق صاحب کا جینئس ٹی وی اور ریڈیو کی نظر ہو گیا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو ادب تک ہی محدود رکھتے تو ادب میں ایک منفرد مقام پا لیتے۔

الغرض ان حضرات کے آنے کے بعد نہ صرف آزاد کشمیر ریڈیو کی نشریات کا معیار کہیں بلند تر ہو گیا بلکہ تراڑکھل کی بوجھل فضا میں ایک نئی زندگی آ گئی۔ تراڑکھل میں ہمارے

کام کی جگہ اور رہائش تقریباً ساتھ ساتھ تھیں۔ اسی وجہ سے دفتری اوقات کے بعد بھی ہمارا بیشتر وقت اکٹھے ہی گزرتا اور ہمیں ایک دوسرے کی تمام تر کمزوریوں اور خوبیوں کا علم ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے گہری محبت تھی۔ مفتی جی عمر میں ہم سب سے بزرگ تھے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ کسی ایکٹویٹی میں ہم سے پیچھے رہیں۔ سردیوں میں جب برف باری ہوتی تو سب لوگ اوور کوٹ پہن کر چھڑی ہاتھوں میں لئے برف پر Cross Country دوڑ لگاتے۔ برف پر سے پھلانگتے، کودتے، پھسلتے اور گرتے میلوں چلے جاتے۔ تراڑکھل کے چھوٹے سے بازار میں کھجوریں اور کریم کھاتے اور پھر واپس اپنی ڈیوٹی پر ڈٹ جاتے۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں مفتی جی نے کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔

یوں تو آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کرنے والے سبھی احباب آگ کے دریا پار کر کے یہاں پہنچے تھے اور سب کے دلوں میں پاکستان کیلئے بے پناہ عقیدت اور محبت کے جذبات موجزن تھے لیکن اس والہانہ محبت میں مفتی جی سب سے سبقت لے گئے تھے۔ جب ملکی حالات زیادہ دگرگوں ہوتے تو مفتی جی ہی سب کی ڈھارس بندھاتے کہ پیارو یہ ملک قدرت نے خود بنایا ہے اور وہی اس کی حفاظت کی ضامن ہے۔ اس سلسلے میں وہ اکثر صوفی برکت علی صاحب سالاروالا کے ارشادات کا سہارا لیتے۔

سیر و تفریح کا شوق آخری عمر تک مفتی صاحب کے ساتھ رہا۔ جب بھی کاروبارِ حیات سے دل برداشتہ ہوتے چھڈ یاروں کو اکٹھا کرتے اور جہاں گردی کیلئے نکل جاتے۔ سہون شریف، تھرپارکر، گلگت، ہنزہ، گوپس، کاغان، سوات، وادیٔ کیلپا اور نیلم غرض کوئی بھی جگہ ان کیلئے دور نہیں تھی۔

ناران سے جھیل سیف الملوک تک کا سفر انہوں نے ایک کوہستانی کے کندھے پر سوار ہو کر کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ تھی اور ڈھائی تین ہزار فٹ کی چڑھائی چڑھنا جوانوں کیلئے بھی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انہوں نے سب کا بھرپور ساتھ دیا۔ ایک دفعہ جب ہم لوگ ایوبیہ گئے تو ان کا پروسٹیٹ کا چوتھا آپریشن ہو چکا تھا اور ہر آدھ گھنٹے کے بعد انہیں پیشاب کی حاجت ہوتی جس کے بعد کوئی آدھ گھنٹہ وہ شدید درد میں مبتلا رہتے

لیکن سفر کے دوران انہوں نے ہمیں اس تکلیف کا احساس بھی نہیں ہونے دیا۔ ان تمام صحرا نوردیوں اور کوہ پیمائیوں کے دوران مفتی جی کے ساتھ گزرنے والا وقت اور ان کی دلفریب باتیں ہمارے سفر کی زادِراہ اور اس میں ہونے والی مشقت کا انعام ہوتیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

-☆-

بشریٰ اعجاز

آپ کا بھید کیا تھا؟

رات کے دو بج رہے تھے۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ہماری حج فلائٹ تھی۔ سارے ہم سفر نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ میرے ہاتھ میں ممتاز مفتی کی ''لبیک'' تھی۔ جسے میں پچھلے دو گھنٹوں سے پڑھ رہی تھی مگر وہ ابھی آدھی سے زیادہ باقی تھی۔ کالا کوٹھا اور اس کے اوپر جھانکتا ہوا تنہا اداس بوڑھے کا چہرہ، اور نیچے اس اداس بوڑھے کی موجودگی سے بے خبر ''لبیک اللھملبیک'' کہتا ہوا ایک ہجوم۔ قدرت اللہ شہاب اور ان کی افسری کے تانوں بانوں سے ٹپکتی قلندری، ایڈووکیٹ صاحب، رومی ٹوپی والے اور ان کی پیش گوئیاں۔ کتنی نا قابل فہم اور گمراہ کن باتیں تھیں۔ توبہ توبہ!!

ان دو گھنٹوں کے دوران اگر آنکھیں کاغذوں پر محوِ سفر تھیں تو ذہن تاویلوں کے راستے پر برق رفتاری سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ دوران مطالعہ کئی بار بے ادبی کے خیال سے لبیک رکھ دینے کا خیال آیا مگر از راہِ تجسس ایسا نہ کر سکی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد احرام باندھ کر جب کار میں بیٹھ رہی تھی تو میری عجیب کیفیت تھی۔ مناسکِ حج دعائیہ کتابیں اور آداب حاضری کے متعلق جو کچھ بھی پڑھا اور سنا تھا۔ لبیک پڑھ کر وہ بھک سے یوں اُڑ گیا تھا جیسے کسی نے بارود کو آگ لگا دی ہو۔ اس جلی جلی حالت میں مَیں جب حرم شریف پہنچی تو دھماکے والی جگہ سے برابر دھواں اٹھ رہا تھا اور مجھے کچھ بھی ٹھیک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کالے کوٹھے کے بنیروں سے جھانکنے والے اداس بوڑھے کو پاگلوں کی طرح کھوج رہی تھی اور بیت اللہ شریف کے پاسبان میلہ، گم خلاص کے چابک میرے بدن پر برسا برسا کے مجھے وہاں سے نکال رہے تھے۔ میں اپنے نیلو نیل وجود اور اپنی داغی روح کے ساتھ وہاں دھکے کھاتی پھر رہی تھی۔

ارے وہ مستوں کے ٹولے کہاں ہیں جو مفتی کے اردگرد رہا کرتے تھے۔ وہ اداس چہرے والا تنہا بوڑھا کیا ہوا جسے سینے سے لگا کر، لوریاں سنا کر وہ تھپک تھپک کر سلایا کرتے تھے، ارے آنکھیں تو میری بھی زندہ ہیں پھر دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ عجیب صورتِ حال تھی وہاں تمام وقت مجھے ایسے لگتا رہا جیسے میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر مجھے شیشے کے گھر میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کیلئے بند کر دیا گیا ہے، جیسے میرا اپنا عکس کالک کی طرح میرے چہرے پر مل دیا گیا ہو جیسے میں سب سے چھپاتی پھر رہی ہوں۔ وہ کالا کوٹھا جس کے اندر باہر مفتی جی آنکھیں میچ کر دیکھ لیتے تھے۔ مجھے تو اس کی دیوار کا وہ رُخ بھی صحیح طور پر نظر نہ آتا جو میرے سامنے موجود ہوتا تھا۔ ''جانی، جاندیئے!'' میں بار بار افسوس سے ہاتھ ملتی تھی۔ لبیک نے مجھ سے میرا عرشوں والا رب اور بیت اللہ شریف چھین کر اک ایسی الجھن دے دی تھی جو کسی طور سلجھتی ہی نہ تھی میں کیا کروں۔ بیت اللہ شریف کے غلاف سے لپٹ کر روتی تھی اور خود کو کوستی تھی۔

اس کے بعد میں نے ممتاز مفتی کی کتابوں کو نہ پڑھنے کا عہد کر لیا مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ایک دن کہیں سے، بغیر جلد اور عنوان کے ضخیم کتاب ہاتھ لگی، جس کے شروع کے چند صفحات غائب تھے۔ اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو بغیر رُکے پڑھتی ہی چلی گئی۔ جب پتہ چلا کہ کتاب ممتاز مفتی کی مشہور تصنیف ''علی پور کا ایلی'' ہے تو اس وقت پلوں کے نیچے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ شہزاد مر چکی تھی اور ایلی کو رومی ٹوپی والے بابوں نے Fascinate کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے آگے کچھ نہ پڑھ سکی۔ گنجلتا کچھ اور بڑھ گئی۔ کبھی ممتاز مفتی مجھے وارث شاہ کے مشہور کردار رانجھے کی طرح من کے بیلے میں پریم کی ونجلی بجاتے نظر آتے اور کبھی اس تیاگی کی طرح لگتے جسے کاماؤں نے ادھ موا کر کے دنیا تیاگنے پر مجبور کر دیا ہو اور جو بلبلاتا ہوا، تھو تھو کرتا جنگل کی طرف منہ کر گیا ہو۔

انہی دنوں اتفاق سے مجھے ان کی ایک جتی ستی کہانی ''ایک ہاتھ کی تالی'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کہانی کو پڑھ کر میں بہت عرصہ بُت اور چیت کے سحر میں گم رہی۔ میرے اندر اس کہانی کے تینوں کردار جمال، کمال اور میں اک عرصہ دھمال ڈالتے رہے۔ میرا دل کرتا،

میں اس شخصیت سے ملوں، جس نے زندگی کو الٹی طرف سے ادھیڑ ادھاڑ کر اتنی رنگ رنگ کی کترنیں جمع کر رکھی تھیں آخر وہ سیدھی طرف سے کیوں نہیں ادھیڑتا؟

انہی دنوں نئی دلی کے پرگتی میدان میں ادیبوں کے جھرمٹ میں، مجھے عام سی شخصیت والا ایک Un-impressive بوڑھا بار بار نظر آیا جو ہمہ وقت پارے کی طرح مضطرب رہتا تھا۔ جس کے پاؤں کے ساتھ دادروے بندھے ہوئے لگتے تھے اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو جیسے اس نے بہت دور جانا ہو، چاند ستاروں کے مسکنوں سے بھی آگے۔

''یہ مفتی جی ہیں'' ایک دن مجھے کسی نے بتایا۔ اچھا! میں نے بمشکل اپنی ایکسائٹمنٹ چھپائی اور بے اختیاری میں ان کی طرف قدم بڑھایا۔ ''بڑے دل پھینک ہیں۔ ان سے ملتے وقت یہ بات دھیان میں رکھنا۔'' نہیں۔۔۔۔ میرے اندر ایک لرزا دینے والا دھماکہ ہوا۔ ملبہ گرا۔ اتنی دھول اڑی کہ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ ''مگر اب تو یہ بہت بوڑھے۔۔۔!'' ''صرف ظاہری طور پر، اندر سے نہیں۔'' کہنے والے نے ہنس کر کہا اور میرے اُٹھتے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔

مفتی جی! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں، چونکہ بزدل ہوں اس لئے ڈرتی ہوں۔ مجھے اپنی نیک نامی بہت عزیز ہے۔ آپ کا کیا ہے آپ تو اپنے آپ کو ٹکٹکی پر چڑھا کر خود ہی کوڑا ہاتھ میں لے کر کھڑے ہونے کے عمل میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور پھر تماشائیوں کی بھیڑ میں بھی سب سے آگے کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہیں۔ اپنے آپ پر پھبتیاں کس کر، اپنی شخصیت کو دھجی دھجی گلیوں میں بکھیر کر روحانی مسرت حاصل کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ مگر میں اتنی بہادر نہیں۔ اتنا ظالم سچ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں جھوٹ کو مصلحت کہہ کر خود کو مطمئن کرنے والوں میں سے ہوں اور آپ سچ کو تہمت کی طرح پیشانی پر سجا کر خوش ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ان حالات میں مَیں آپ سے کبھی بھی نہ مل سکوں گی۔

پھر مجھے مفتی جی کی پیاری پروین عاطف مل گئیں۔ پروین کی محبتوں کے گداز نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ پروین اپنے بابا کی دیوانی ہے۔ اس کی گفتگو میں بابا کا ذکر پہاڑی

جھرنے کی گنگناہٹ کی طرح ہمہ وقت گونجتا رہتا ہے۔ بابا کی بات کرتے وقت اس کا لہجہ مامتا کی محبت سے یوں لبالب بھرا ہوتا کہ مجھے لگتا وہ چھلک جائے گی اور چھلک چھلک کر خالی ہو جائے گی۔ مجھے بابا اس کا وہ لاڈلا بچہ لگتا جسے اُس نے بے اولادی کے طعنے سے بچنے کیلئے مزاروں اور خانقاہوں پر ماتھا رگڑ رگڑ کر حاصل کیا ہو اور اب جسے بڑے دُلار سے ڈھاک پر اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہو۔

الکھ نگری چھپنے کے کچھ عرصہ بعد مفتی جی لاہور آئے۔ پروین نے مجھے فون کیا ''بابا جی لاہور آئے ہوئے ہیں۔ دو چار دن رُکیں گے۔ میں نے ان کیلئے ہوٹل میں ایک سادہ سی تقریب کا اہتمام کیا ہے۔ اس میں چند قریبی لوگ ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ میں چاہتی ہوں تم بھی کچھ کہو مگر میں! ان پر کیسے کچھ، مجھے سمجھ نہ آئی میں کیا کہوں۔ میری جان! کوئی مجبوری نہیں اگر پنجابی میں چند لائنیں کہہ سکو تو مجھے خوشی ہوگی۔ پروین کے لہجے میں ہمیشہ والی سہولت تھی، محبت تھی اور گنجائش تھی۔ پروین سے بات کرنے کے بعد میں نے خود کو ٹٹولا۔ علی پور کا ایلی، لبیک، ایک ہاتھ کی تالی، روغنی پتلے اور نجانے کیا کیا۔ ارے مجھے تو مفتی جی سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ آخر انہیں اپنے قاری کو کنفیوژ کرنے کا حق کس نے دیا۔ کس نے کہا کہ اپنے پاس رنگ برنگ کے جذبوں، کیفیتوں اور لفظوں کے ڈھیر لگائیں ان کے نفسیاتی تجزیے کریں پھر دل پھرول کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر، ان کے نیچے دبا ہوا سچ نکالیں اور پھر ایسے بہت سے سوالوں کے شور میں ڈوبتے ابھرتے میں نے مفتی جی پر اپنی پہلی اور آخری پنجابی نظم لکھی۔ جس کی چند لائنیں یہ ہیں؛

اک ہتھ دے نال تاڑی کیکر وجے

اسیں آں روغنی پتلے

ویلے دیت وچ قید اساڈے

دکھ سکھ تے جگراتے

تلاش دے کھورو

روح تے کُھلدے

بنے اتے بیٹھے ہلدے

جیہڑا راہ کولا جاپے

اوسے راہ دے پینڈے بھردے

ساڈی نیندر، موت، حیاتی

کس دے ناں؟

کینوں لبھدے آں؟

اگلے روز پروین باجی کا فون آ گیا۔ میں نے بتانا تھا کہ پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔

مگر وہ کیسے؟ میں پریشان ہو گئی۔

دراصل ہم نے یہ سب بابا کو بتائے بغیر کیا تھا۔ ارادہ تھا کہ فنکشن کے وقت انہیں وہاں لے جائیں گے اور پروگرام کی شکل کچھ اس طرح کی رکھیں گے کہ جس پر انہیں اعتراض نہ ہو مگر کل شام سب کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ ایک مقامی ادیب نے فون پر انہیں الکھ نگری کی مبارک باد دی اور کہا کہ کل کی تقریب میں آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں بھی آؤں گا۔ بابا جی نے اس کی بات سن کر تقریب کے بارے میں لاعلمی کا ذکر کیا اور اسے آنے سے منع کر دیا۔ فون بند کر کے انہوں نے مجھے اچھی طرح جھاڑا۔ تم میرا جلوس نکالنے پر کیوں تلی ہوئی ہو۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں مجھے شہرت نہیں چاہیے۔ آخر تم لوگ میرا پروپیگنڈہ کر کے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اب بہت ہو چکا۔ جاؤ بابا، مجھے معاف کرو۔ لڑتے جھگڑتے انہوں نے سامان باندھا اور فلائٹ کے وقت کا انتظار کیے بغیر فلائنگ کوچ پر اسلام آباد چلے گئے۔

اب کیا ہو گا پروین باجی'' ہونا کیا ہے، اب میں فرداً فرداً تمام لوگوں سے معذرت کر رہی ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس دفعہ بابا جی نے ذلیل کر کے رکھ دیا ہے''۔ پروین کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

اس کے بعد کچھ عرصہ پروین رام نام کے جاپ سے تائب ہو گئی۔ اس نے ڈھاک پر اٹھایا ہوا لاڈلا بالکا، ذرا سی دیر کو پالنے میں سلا دیا۔ بڑی دل جمی سے چند افسانے لکھے۔ افریقہ میں گرمیاں گزاریں اور واپسی پہ بابا جی کے پاس جا پہنچی۔ اب غبار چھٹ چکا تھا۔

مطلع صاف تھا۔ ڈیرا کھلا تھا۔ بابا جی موجود تھے اور یہ تمام عرصہ آہ وزاری میں گزار کر اس کیلئے خاصے ہلکان ہو چکے تھے۔

دراصل بابا جی وقتی طور پر اس طرح ری ایکٹ کرتے ہیں۔ بعد میں بہت جلد انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہو جاتا ہے۔ داستان سرائے جاتے ہوئے پروین نے کہا ''تم خود انہیں اپنے گھر انوائیٹ کرو۔'' ''کیا وہ مان جائیں گے؟'' ''کیوں نہیں، بس ان کی یہی شرط ہو گی کہ ان کے گرد مجمع نہ ہو۔ ویسے بھی کل ان کی برتھ ڈے ہے وہیں تمہارے گھر کیک کاٹیں گے۔'' پروگرام طے ہو گیا۔

مفتی جی، داستان سرائے کے لاؤنج میں ایک صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے ان کے پاس چند احباب جمع تھے جن کے ساتھ بڑے خوشگوار موڈ میں وہ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے پروین کے ساتھ دیکھ کر پوچھا۔ ایہہ کڑی کون اے۔ پروین نے میرا تعارف کرایا اور کہا اس نے آپ پر نظم لکھی ہے۔

''اچھا کہاں ہے وہ نظم؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے لفافے میں بند نظم ان کی طرف بڑھائی۔

''اسے میں غسل خانے میں جا کر پڑھوں گا''۔ لفافے کو الٹتے پلٹتے ہوئے وہ بولے تو ان کے ہونٹوں کے کنارے دبی دبی شرارت سے بھیگنے لگے۔

''نہیں بابا جی! یہ نظم غسل خانے والی نہیں مجلس میں پڑھنے والی ہے۔'' پروین نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر مجھے پڑھ کر سناؤ۔'' انہوں نے نظم دوبارہ مجھے تھما دی۔ نظم سننے کے بعد وہ بولے:

''اپنی کتاب اور غیر مطبوعہ کلام مجھے بھجواؤ۔ میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''مفتی جی میں آپ کے ساتھ اپنے اندرونی تعلق کا بے تکلفی سے اظہار کرنا چاہتی ہوں مگر ڈرتی ہوں بے ادبی نہ ہو جائے۔''

''او نہیں ہوتی بے ادبی، تم جو لکھنا چاہتی ہو وہ لکھو، مگر مجھے ضرور دکھانا۔''

کسی نے پوچھا، ''علی پور کا ایلی'' آپ نے کس خیال کے تحت لکھی بولے: ''عام ادیب اپنے بارے میں سچ بولنے سے کتراتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں وہ سچ لکھا جو لوگوں سے ہضم کرنا مشکل ہو گیا۔ میرا خیال تھا وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک چلے گی مگر اس وقت مجھے بڑی حیرت ہوئی جب وہ قائم ہو گئی۔ وہ کتاب دراصل میں نے طعنے کے طور پر لکھی تھی۔''

''لبیک'' میں خدا کے ساتھ تعلق کی جو شکل بنی وہ کس طرح قائم ہوا؟''

بولے: ''میں نے خدا کو مسند سے اتار کر انگلی سے لگالیا۔ اسے دوست بنالیا اس طرح ہو گئی ورنہ اگر میں اسے محبوب بنالیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ پھر وہ مجھے چھاڈال لیتا۔ اگر وہ چھاڈال لے تو بندہ کسی جوگا نہیں رہتا۔'' توبہ توبہ لرز کر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ میں نے دیکھا اس وقت ان کی شخصیت ان بوجھی سی لگنے لگی۔ ایسے سوال کی طرح جس کا جواب سامنے ہوتا ہے مگر وہ ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

کسی نے پوچھا: ''اللہ کے قریب کس طرح ہوا جاتا ہے؟''

''اللہ کے قریب''، وہ اپنی شفاف مسکراہٹ سے ہونٹوں کے اندر کوئی راز دبا کر بولے ''بڑا سمپل طریقہ ہے ہر روز رات کو سوتے وقت صرف یہ کہہ دیا کرو، تھینک یو اللہ میاں جی! اور بس، وہ خوش ہو جاتا ہے۔''

''بس اتنے سے ہی''؟ ہاں تو اور کیا؟ اللہ کوئی انسان ہے جو ہر وقت اپنے سامنے کورنش بجواتا رہے۔'' ان کے یقین میں ہلکی سی شوخی بھی تھی۔

اس سے اگلے روز میں نے مفتی جی کو خط لکھا۔

''آپ کی ایک چھوٹی سی بات نے مجھے رات بھر جگائے رکھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ چھوٹا سا اور سمپل فقرہ اپنی زبان سے ادا کر کے سو جاؤں مگر میں کوشش کے باوجود ادا نہ کر سکی اور رات گزر گئی۔ اب یا تو اسے سمپل نہ کہیے اور یا پھر مجھے اس کی ادائیگی کا طریقہ بتائیے۔

اس خط کے جواب میں میری تعریفیں کر کے انہوں نے مجھے بڑی خوبصورتی سے ٹال

دیا، لکھا۔

''میں نے تمہاری نظمیں پڑھیں اور محسوس کیا کہ تم بڑی شاعرہ ہو اور جب ذاتی Passion کی شدت سے نکل کر Love Desireless پر آؤ گی تو بہت بڑی بن کر ابھرو گی پھر لکھا تمہارے اندر والہانہ عشق کا جذبہ ہے۔ دکھ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تم میری سمجھ میں نہیں آئیں۔''

واہ مفتی جی! یہ بھی خوب رہی۔ Love Desireless اک اور پہیلی۔ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا مگر میں ٹلوں گی تو نہیں۔ اس کے بعد میں نے انہیں لکھا۔

''مجھے لگتا ہے آپ بہت کچھ جانتے ہیں، مجھے مطمئن کر سکتے ہیں مگر یا تو آپ بتانا نہیں چاہتے، یا پھر۔۔۔''

اس کے جواب میں انہوں نے لکھا۔

''بڑا تخلیق کار پیدا کرنے کیلئے قدرت کو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اسے دکھ کے طوفان سے گزرنا پڑتا ہے جو دکھ کی بھینٹ سے نہیں گزرتا وہ کبھی بڑا فنکار نہیں بن سکتا لہٰذا اس کٹھالی سے خوش دلی سے گزرو۔''

اس طرح انہوں نے مجھے تسلی دی۔ مجھے بہلا دیا مگر میں الجھ گئی، مزید الجھ گئی۔ اگلی رات گیارہ بجے جب میں اس خط کو پانچویں دفعہ پڑھ رہی تھی تو مجھے اطلاع ملی۔۔۔

مفتی جی چلے گئے۔

کیوں؟ کب؟ کیسے؟ میرے منہ سے نکلا بس اتنا تھوڑا وقت ابھی تو مجھے بہت کچھ کہنا تھا۔ ابھی تو اس مختصر فقرے کا بوجھ بھی بانٹنا تھا۔ جو آپ نے بڑی آسانی سے میرے سر پر رکھ کر خود کو آزاد کر لیا۔ میں تو ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہوں۔ وہیں Thank you اللہ میاں جی!'' میں، اور آپ!!

مفتی جی نے کہا، اگر وہ چھا ڈال لے تو بندہ کسی جوگا نہیں رہتا۔ توبہ توبہ۔

کملا نے سدھارتھ سے کہا۔

''جانِ من، تم بھتیر سے ابھی تک سادھو ہو۔ درحقیقت تم مجھ سے پریم نہیں کرتے تم

کسی سے بھی پریم نہیں کرتے۔ کیا یہ سچ نہیں؟

''شاید'' سدھارتھ نے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ تم بھی کسی سے پریم نہیں کرسکتیں ورنہ تم پریم کو فن کی طرح نہ برتو۔'' شاید ہم جیسے آدمی پریم نہیں کر سکتے۔ عام لوگ پریم کرسکتے ہیں۔ یہی ان کا بھید ہے۔

مفتی جی! مگر آپ نے تو تمام عمر پریم کیا اور خوب کیا۔ آپ عام آدمی تو نہ تھے تو پھر آپ کون تھے؟

گو آپ نے بہت سی بھید کی باتیں بتائیں مگر اصل بات میں ڈنڈی مار گئے۔

یہی آپ کا بھید تھا۔

-☆-

ڈاکٹر نجیبہ عارف

مفتو مفتی

زندگی کا لمبا چوڑا سوالنامہ میرے ہاتھ میں آیا تو میں دم بخود رہ گئی۔ مجھ سے بے رنگ خاکوں میں رنگ نہیں بھرے جاتے، ادھوری کہانیاں پوری نہیں ہوتیں، خالی جگہ کو پر کرنا تو اور بھی مشکل۔ کبھی لفظ نہیں ملتے، کبھی معانی ہاتھ سے نکل جاتے ہیں پھر ایسی گنجلک تحریر کو موزوں عنوان دینا۔۔۔ ناممکن!!! کم از کم میرے بس کی تو بات نہیں۔ نہ کوئی خلاصہ کام آئے۔ نہ ٹیسٹ پیپر، گائیڈ بکس ہیں کہ فہم سے باہر۔ قریب آنے والے ہر شخص کی کمر پر ٹہوکا دیا، سنو تمہیں جواب آتا ہے، مجھے بھی بتاؤ، در در پر بھٹکتی رہی۔ کوئی ہے، جو مجھے راستہ دکھائے، میری لاٹھی بنے، میرے سوالوں کے جواب دے۔۔۔ کوئی ہے۔۔ کوئی ہے۔۔۔ یونہی ٹھوکریں کھاتے کھاتے ''علی پور کا ایلی'' میرے ہاتھ لگ گئی۔ ابن انشاء نے کہا تھا ''علی پور کا ایلی'' گنہگار کی محفل ہے۔ عورت ہونے کے ناطے مجھے اس محفل میں شامل ہونے کا حق تو نہیں تھا، نہ مجھ میں ''علی پور کا ایلی'' بن جانے کی تاب ہی تھی مگر کسی نہ کسی طرح میں اپنی ناکردہ کاری کی حسرتوں کی دادخواہی سیکھ چکی تھی۔ چنانچہ میں نے بڑے اہتمام سے شروع سے لے کر آخر تک ''ایلی'' کی ساری زندگی خود پر بتالی اور جب کتاب ختم ہوئی تو میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ ''نجانے کہاں سے چمکنے والی کرن'' اور ''نجانے کدھر کو لے جانے والے راستے'' کی منتظر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

حالانکہ مفتی جی کے بقول یہاں تک پہنچنے کیلئے چار مرحلوں سے گزرنا لازم تھا،

۱۔ کسی سے ٹوٹ کر محبت کرنا۔

۲۔ محبت میں یوں کامیاب ہونا کہ محبوب تخت پر بٹھا کر مورچھل کرنے لگے۔

۳۔ پھر لات مار کر تخت سے نیچے گرا دے اور خوب تذلیل کرے۔

۴۔ اور آخر میں محبوب اور محبت سے بے نیاز ہو کر کسی بالاتر حقیقت میں گم ہو جائے۔

میں نے جب یہ کتاب پڑھی، تب تک ابھی پہلا مرحلہ بھی سر نہ کیا تھا لہٰذا کامیابی یا ناکامی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ از خود بھی کسی نے مجھے مورچھل کے قابل نہ جانا تھا کہ لات مار کر تخت سے نیچے گرانے کی صورت پیدا ہوتی۔

لہٰذا میں سیدھی بچپن کی بے خبری سے نکل کر ادھیڑ عمر کی بے نیازی کے لق و دق ویرانے میں جا بیٹھی اور میری حالت اس برائلر چوزے کی سی ہو گئی، جو ماں کے سینک اور اکیس دن کی تپسیا کے بغیر ہی انڈے سے باہر نکل آتا ہے اور ساری عمر واپس نہیں جا پاتا۔ یہ کیسے گنہگار کی محفل تھی جس نے مجھ سے چار دن کی فرصتِ گناہ بھی چھین لی اور پروردگار کے حوصلوں کو طعنہ دے کر دل ٹھنڈا کرنے کی صورتِ تلافی بھی۔

غصے، حسد اور جلن سے، جو کمزور لوگوں کا وطیرہ ہے، میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

بے اختیار ہو کر میں نے ایلی کو خط لکھا۔

کیوں۔ آخر کیوں؟ .... تجھے کیوں بلا لیا گیا؟ .... کیوں نواز دیا گیا؟ .... مجھے کیوں نہیں؟ .... بتا او ے ایلی ....

میں نے جیسے بازار میں کھڑے ہو کر اس کا گریبان کھینچ لیا۔ ''ہاں میرا اندر بھی کالا ہے، ناپاک ہے، آلودہ ہے۔ مجھے کیوں نہیں کوئی دھوبی ملا؟ آخر اس کا Criteria کیا ہے؟ نہ عابدوں سی عبادت قبول ۔۔۔ نہ زاہدوں سا زہد منظور، نہ دعاؤں سے پسیجتا ہے، نہ خطاؤں پہ ریجھتا ہے ۔۔۔ آخر وہ تیرا کالے کوٹھے والا کن اداؤں پہ فریفتہ ہے۔'' رو رو کر میری آنکھیں سوج گئیں اور خط کے صفحے پر لفظوں کی سیاہی پھیل گئی۔ جواب میں اس کا شوخی سے مُسکراتا، آنکھیں مارتا خط آن پہنچا۔

۔۔۔ ''تو نے ڈگڈگی بجائی۔ بندر بدمست ہو کر گھنگھری پہنے بغیر ناچا۔

یا اللہ، یہ میری جنت میں سانپ کیسے آ گیا۔

اسّی سالہ بڈھے کی محبوبہ بننے سے فائدہ؟

اپنی تصویر بھیجو۔۔۔"

اور آخر میں کسی نظم کی وہی چند سطریں جو وہ مجھ سے پہلے اور بعد میں بھی نجانے کتنی لڑکیوں کو خطوں میں لکھ لکھ کر بھیجتے رہے۔ وہ شیشہ ہائے مے کشی کہ مصلحت اسی میں تھی جنہیں وہیں پڑے پڑے وہیں کی خاک کھا گئی۔ پھر ان کو ڈھور ہا ہوں میں یہ کیا بنا رہا ہوں میں ہکا بکا رہ گئی پھر ہر خط میں میری تصویر کشی ہونے لگی۔ کبھی۔۔۔"تو شخصیت کی ہری بھری پھولوں والی ٹہنی پہ بیٹھی ہے۔ پھر روتی کیوں ہے"۔۔۔ کبھی۔۔۔"کچ کا تڑکا ہوا گلاس ہے۔ باہر سے ثابت دکھتا ہے۔ پر ذرا ہاتھ لگاؤ تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔"

ایک بار شو میں آ کر میں نے اپنی ایک نظم لکھ بھیجی۔۔

جواب آیا۔

"دیکھ میں تو پہلے ہی تیری لیاقت کا قائل ہو چکا ہوں۔۔۔ جب کوئی مان جائے تو پھر کرتب دکھانا Over doing ہو جاتا ہے۔" میرے پروں پر اوس پڑ گئی۔

پھر ایک دن ہسپتال سے اس کا خط آیا۔ لکھا تھا۔

"تو نے مجھے جو پہلا خط لکھا تھا۔ وہ از خود نہیں لکھا تھا۔ وہ خط لکھنا تجھ پر عائد کر دیا گیا تھا۔ میں بیمار ہوں۔ جانے والا ہوں۔ "وہ" مجھ سے پوچھیں گے وہ ناؤ ڈب جھلکے کھا رہی تھی۔ تو نے اسے بچایا کیوں نہیں۔ ڈوبنے کیوں دیا۔ ہو سکے تو مل جاؤ۔۔۔" بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ڈب جھلکے کھاتی ہوئی ناؤ نے اترا کر سوچا، چلو کام بن گیا۔ کسی نامعلوم "وہ" نے جاتے ہوئے ممتاز مفتی کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ اب یہ پتوار لے کر طوفانوں کے مقابل زور لگائے گا اور میری ناؤ کو دوسرے کنارے کی بہشت تک لے جائے گا۔ جہاں ہر دیوار پر میرے سوالوں کے جواب لکھے ہوں گے۔ ہر موڑ پر ہدایت نامہ آویزاں ہو گا۔ ہر چوراہے پر رہنمائی کے فرشتے منتظر کھڑے ہوں گے۔ مجھے سب پتہ چل جائے گا۔ معرفت عطا ہو جائیگی۔ وجدان، ایمان، ایقان سب حاصل ہو جائیگا۔ میں کافر سے مومن، مردود سے محبوب ہو جاؤں گی۔

پر کچھ بھی نہ ہوا۔۔۔۔

اسلام آباد کے ایک زمین دوز سے مکان کے ملاقاتی کمرے میں میلی کچیلی، خاکی قمیض اور ملیشے کی شکنوں بھری شلوار میں ملبوس ممتاز مفتی نے مجھے دو تین بار اٹھا بٹھا اور گھما پھرا کر غور سے دیکھا۔ میرے کپڑوں کے رنگ اور چہرے کے نقوش پر گہرا تبصرہ کیا۔ اپنی چُبھتی ہوئی تیز نظروں سے سرتاپا میرا بھرپور جائزہ لیا اور وہ باتیں کرنے لگے، جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''تم ایک نہیں دو ہو۔۔۔ یہ نہیں، وہ ہو۔۔۔'' قسم کی باتیں۔ میں نے دل میں کہا ، دو کیوں، سو کہیئے، مگر میں تو یہ پوچھنے آئی ہوں کہ میری باری کب آئے گی۔ آئے گی بھی یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔ اور چلو نہیں تو نہ سہی مگر پھر یہ بھانبھڑ سا میرے اندر کیوں مچا رکھا ہے؟ میرے تلووں سے انگارے کس لیے باندھ دیئے ہیں؟''

مگر مفتی جی نے مجھے اس طرف آنے ہی نہ دیا۔ میں جیسی گئی تھی ویسی کی ویسی لوٹ آئی۔ میلی چیکٹ، کالی سیاہ، خالی ڈھول۔۔۔ تڑپ اور بڑھ گئی۔ مفتی جی سے خط و کتابت ختم ہو گئی۔ راستے دُھند سے اٹے رہے۔ نظر ڈبڈبائی ہوئی۔ قدم ڈگمگائے ہوئے۔۔۔

کم و بیش تین سال بعد ازدواجی زندگی کے آغاز ہی میں مفتی جی نے آشیر باد دے کر ہمیں اسلام آباد بلا لیا۔ اسلام آباد میں سوائے اُن کے، ہمارا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے بھی پہلے دن سے لے کر وفات کے دن تک ہم دونوں کو اپنے دوارے بٹھائے رکھا۔۔۔ اپنے گوڈے موہرے۔۔۔ مگر یہ رشتہ پیری مریدی کا نہ تھا۔ یہ مداح اور ممدوح کا رشتہ بھی نہ تھا۔ یہ تو لڑائی جھگڑے کا رشتہ تھا۔ انہوں نے کبھی میرے کسی سوال کا ٹھیک سے جواب نہ دیا۔ الٹا وہ میرے سوال ہی رد کر دیتے۔ میں جھلا کر لڑتی وہ بھی مقابلے پر اتر آتے۔ مجھے طعنے دیتے۔۔۔ ''اوہو۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ میں بھول گیا تھا کہ آپ استانی ہیں۔ آپ صرف استانیوں کی طرح سوچ سکتی ہیں۔'' پھر وہ استادوں اور استانیوں کے متعلق اپنی کئی بار سنائی ہوئی کڑی آراء اور Master are Monsters والی کہاوت کو نہایت تفصیل سے دوبارہ گوش گزار کرتے۔ میں چلا کر کہتی۔

''ہاں میں استانی ہوں۔ نہ بھی ہوتی تو بھی ایسی ہی ہوتی۔ یہ استانی ن میرے خون

میں ہے۔ پر یہ کس نے ڈالا۔ کس نے بنایا مجھے ایسا؟ بتائیں؟ میں خود بنی ہوں ایسی؟ اگر ان کے گھر والوں کا ڈر نہ ہوتا تو شاید میں ان کا کالر نوچ لیتی پھر وہ ہنستے۔ پینترا بدلتے۔

''جس نے ایسا بنایا ہے اس نے کچھ سوچ کے ہی بنایا ہوگا نا۔ کوئی مقصد تو ہوگا اس کا۔ تو کیوں نہیں اس مقصد کو پورا کرتی۔ اس غصے کو کام میں کیوں نہیں لاتی۔ تخلیق کے کام میں۔ تو لکھتی کیوں نہیں''۔ میں پھر بحث و تکرار میں مبتلا ہو جاتی۔

انہوں نے کبھی مجھے کوئی اور نصیحت نہ کی تھی اگر کرتے بھی تو میں کون سا مان لیتی۔ البتہ ایک بار جب وہ سردیوں کی دھوپ سینکنے گھر کے باہر، جنگل میں، لوہے کی کرسی ڈال کر تنہا بیٹھے تھے اور قریب ہی پنجرے میں اصغری کے مُرغے مُرغیاں کٹ کٹا رہے تھے، انھوں نے مجھے سختی سے ڈانٹا اور کہا:

'' دیکھ! محبت کو کبھی مت ٹھکرانا چاہے وہ عام سی سطحی محبت ہی کیوں نہ ہو۔ لوگوں سے محبت کر۔ انہیں اُمید دلا۔ بے آس نہ کرنا۔

پھر بولے: ''خبردار! آج سے یہ تیری ڈیوٹی ہے۔ شکر کر کہ ابھی میں خود کہہ رہا ہوں۔ نہ مانی تو کوئی بابا پیچھے ڈال دوں گا۔ ڈیوٹی لگوا دوں گا، پھر بیٹھ کر روتی پھرے گی۔''

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''خدا کے لیے آپ مجھے کوئی اور کام دے دیں۔ میں محبت نہیں کر سکتی۔ مجھے جھوٹ موٹ کا دل رکھنا بھی نہیں آتا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔'' اس دن مفتی جی مجھ سے بہت مایوس ہوئے۔ انہوں نے مجھے بُری طرح ڈانٹا۔

''تجھ میں تکبر ہے، انا ہے، تیری مَیں ابھی تک نہیں ٹوٹی تو خود کو اونچا سمجھتی ہے۔'' اتنا ڈانٹا کہ میں رو پڑی اور یہ بھی نہ کہہ سکی کہ کچھ لوگوں کے مقدر میں محبت کی تمنا تو ہوتی ہے استعداد نہیں ہوتی اور مقدر سے کوئی کب تک لڑ سکتا ہے۔

مفتی جی کی بیگم جب میرے میاں کی تعریف کرتیں اور کہتیں۔

''منڈا تے بہت چنگا اے پر کڑی چے کنی اے'' تو مفتی جی کانی آنکھ سے میرے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتے اور فوراً بولتے! ''اقبال ٹھیک کہندی اے، پر اک گل اے۔ تو دوجیاں تے اثر پا سکدی ایں، موثر ثابت ہو سکدی ایں، پر تو کجھ کردی نہیں۔ پتہ

نہیں تو کیوں نہیں میری گل مندی، کیوں نہیں لکھ دی؟ آخر میں تیرا کی وگاڑیا اے؟''

مجھے ذرا بھی پتہ نہ چلتا کہ وہ کس طرح اینٹ پر اینٹ رکھ کر میری شخصیت کے ملبہ کو ازسرِ نو تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔

اکثر کہا کرتے، ''دیکھ نقوش کا حسن پائیدار اثر نہیں رکھتا جو چیز لوگوں کو باندھ لیتی ہے، غلام بنا لیتی ہے، وہ ذہنی حسن ہے۔ فزیکل حسن کی محبت زیادہ سے زیادہ ایک دو سال چلتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے۔ Personality کی محبت ساری عمر رہتی ہے۔ تو بھی اپنے اندر Intellectual Attraction پیدا کر اور یاد رکھ، خالی مطالعے سے حسن پیدا نہیں ہوتا۔ ڈنک تو لکھنے میں آتا ہے، تو مجھ سے ڈنک مارنا سیکھ لے''۔

''لیکن اس کا فائدہ کیا۔۔۔؟'' میں تھڑدلوں کی طرح کہتی۔

''فائدہ؟ تجھے فائدے سے کیا مطلب؟ زندگی کا کیا فائدہ ہے؟

مجھے کیا فائدہ ہے؟ کیوں لوگ مجھے ہاتھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں؟ ۵۰ آدمی روز مجھے ملنے آتے ہیں آ کر دل کے دکھڑے سنا جاتے ہیں۔ کیوں بھئی میں کوئی حکیم ہوں۔ یہی بات پیدا کی ہے نا میں نے اپنے اندر!! میں کتنے لوگوں پر Effective ہوں۔ یہ تھوڑا فائدہ ہے۔ کل کو اللہ تعالیٰ مجھے بلا کر پوچھیں گے کہ کیوں بھئی تم نے کیا کیا وہاں؟ تو میں کہوں گا، ''جناب میں ہزار ہا لوکاں دے اندر دیوا بالیا اے!۔۔۔ اور تیرے اندر بالن دی کوشش کرریا آں۔ تو بالن نئیں دیندی۔''

وہ بہت جھوٹے تھے، جھوٹی تعریفیں کرتے، جھوٹی محبت جتاتے، جھوٹی تسلیاں دیتے۔ مگر اُن کا کمال یہ تھا کہ ہم سب صدقِ دل سے اُن کے جھوٹ کو سچ مان لیتے۔ انہوں نے کبھی پکڑائی بھی نہ دی۔ ادب بھی ان کا نرا پراپیگنڈہ ہی تھا۔ اللہ میاں کا PTV سمجھ لیجئے مگر مجال ہے جو کوئی الزام سر لیا ہو۔ بڑے گھنے تھے مفتی جی۔ جب سرفراز شاہ صاحب نے انہیں تصوف پر ایک کتاب لکھنے کا مشورہ دیا تو بڑا پاکھنڈ مچایا۔

''میں نہیں لکھوں گا کتاب، میں کہاں کا صوفی ہوں۔ مجھے تصوف کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں۔ بس نہیں لکھوں گا۔ کوئی زبردستی ہے۔''

شاہ صاحب نے کہا بھی کہ ''حکم ہو چکا ہے۔ یہ آپ کو لکھنی پڑے گی۔'' مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ''ٹھیک ہے جب حکم مجھ تک پہنچے گا تب دیکھوں گا۔'' یہ میری آنکھوں دیکھی اور کانوں سُنی بات ہے۔ مگر ساتھ ساتھ تصوف پر یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہے۔ قرآن کے ترجمے، تفسیریں، غیر ملکی نومسلموں کی کتابیں، علماء کی کتابیں صوفیا کی کتابیں۔ آخر تلاش کی قسطیں لکھنا شروع کر دیں۔ ہر قسط وہ اپنے ہر ملنے والے کو پڑھاتے۔ اس سے رائے مانگتے۔ مشورہ طلب کرتے۔ تجاویز کو غور سے سنتے اور ان سب کو ایک ایک کر کے بڑے آرام سے رد کر کے، آخر میں وہی لکھا رہنے دیتے، جو انہوں نے خود لکھا ہوتا۔ جب قسطیں ختم ہو گئیں تو ایک دن انہوں نے عکسی مفتی صاحب کو ڈرائنگ روم میں طلب کر کے ان کے سامنے میری قابلیت کا اعتراف کیا اور مجھے اپنا رائٹ ہینڈ ڈیکلئیر کرنے کے بعد تلاش کا مسودہ میرے حوالے کیا اور کہا اسے کتاب کی شکل دے دو مگر بدقسمتی سے ایک تو گواہ کی یادداشت کچی نکلی اور دوسرے میں مفتی جی کی بات کو سچ مان بیٹھی، چنانچہ میں نے بڑے اہتمام سے اقتباسات کو آگے پیچھے کر کے موضوع وار ترتیب مکمل کی مثلاً ایک چیپٹر میں سائنس کے متعلق تمام مواد۔ اگلے چیپٹر میں علم کے متعلق خیالات اور اس سے اگلے میں جزا سزا اور تصور آخرت وغیرہ اور آخر میں پاکستان اور اس کا مستقبل۔

مفتی صاحب نے دیکھا تو سر پیٹ لیا اپنا نہیں میرا۔ مجھے شدت کے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا۔

''جناب، یہ ادبی کتاب ہے۔ کوئی خلاصہ یا ٹیکسٹ بک نہیں ہے۔ میں تو اسے کتاب بھی نہیں بنانا چاہتا۔ کتاب باتیں نہیں کرتی۔ میں چاہتا ہوں، میری تحریر باتیں کرے۔ روز مرّہ کی، ہلکی پھلکی باتیں۔ کوئی ادھر کی کوئی اُدھر کی۔ اگر میں آپ کے مشوروں پر عمل کروں تو کون میری تحریر پڑھے۔۔۔ لیکن قصور میرا ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ آپ کی ذہنیت وہی ہے۔ استادانہ۔۔۔ اور Masters are Monsters ۔

چنانچہ تلاش کا مسودہ ترتیب نہ پا سکا اور آخر میں اسی طرح چھپا جس طرح قسط وار سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہوتا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم ہمیشہ مفتی جی کی غلطیاں

نکالنے اوران کی اصلاح کرنے کے درپے رہتے تھے اور وہ ہم سے کبھی کسی معاملے میں متفق نہ ہوئے پھر بھی انہوں نے ہمیشہ ہماری فکروں کو اپنی فکریں بنائے رکھا۔ ہمارے لئے سرکاری مکان کی تلاش میں تو وہ بے حد سر گرداں رہے۔ پہلے ہمیں بیگم سرفراز اقبال کے گھر یہ کہہ کر بھیجا کہ:

''جاؤ، اوہ وزیراں چے کھیڈ دی اے۔ مکان لے دے گی۔'' پھر جب گجر خان کے پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھے بھی سکھا پڑھا کران کے پاس بھیجا۔

جا کر کہنا ''عالی جاہ، سرکاری مکان چاہیئے بس۔'' میں نے ایسا ہی کیا۔

جواب میں انہوں نے میری اور میرے میاں کی شخصیتوں کا کچا چٹھا یوں کھولنا شروع کیا جیسے میں نے ان سے مکان کی بات کی ہی نہ ہو۔

آپ بہت Possessive ہیں کیا خیال ہی خیال میں دنیا فتح کر ڈالیں گی یا کچھ عمل بھی کریں گی؟۔۔۔ عارف، وہ تو اپنے میں گم رہتا ہے۔ جوڑی اچھی ہے۔ میڈ فار ایچ ادر (made for each other)، مگر دونوں کے اندر تنہائی سی کیوں ہے۔ یہ آپ کا نام نجیبہ کس نے رکھ دیا۔ کس قدر غیر مناسب نام ہے۔''

میں نے منمنا کر کہا ''جناب اب اس عمر میں نام تو تبدیل نہیں ہو سکتا۔''

وہ بولے'' حال تو تبدیل ہو سکتا ہے۔''

وہ کیسے؟۔۔۔ میں نے پوچھا۔ ''ایسے'' انہوں نے ایک کاغذ پر اللہ کے چند نام لکھے اوران کے سامنے 300 بار روزانہ لکھ کر پرچہ میرے حوالے کر دیا۔

میں تلملاتی ہوئی لوٹ آئی۔ مفتی جی کو بتایا تو مسکرانے لگے'' چلو پڑھ لیا کرو۔ کوئی حرج نہیں۔ میں بھی پڑھ لیتا ہوں جتنی بار پڑھا جائے۔'' انہوں نے تکیے کے نیچے رکھی تسبیح کی طرف اشارہ کیا مگر اس وقت تک میری توجہ حال بدلنے سے ہٹ کر مکان بدلنے پر مبذول ہو چکی تھی نتیجتاً حال بدلا نہ مکان۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مفتی جی سے میرے معاملات آخر دم تک طے نہ ہوئے۔ میں نے جو امیدیں مفتی جی سے لگائی تھیں افسوس وہ پوری نہ ہوئیں۔ مجھے میرے سوالوں کے

جواب مل نہ سکے۔ انفس وآفاق کے مسئلے حل نہ ہوئے۔ کسی دھوبی نے میری صفائی ستھرائی کی ذمہ داری قبول کی۔ نہ کوئی رنگریز مجھ بدرنگی کو رنگ برنگی کر سکا۔ سبھی ہنرمند اپنے فن میں کامل اور اس باریک سے نکتے سے واقف نکلے کہ بے رنگ کو رنگنا آسان اور بدرنگ کو رنگنا کارے دارد!!!

اُلٹا مفتی جی جاتے جاتے ایک اور ہاتھ کر گئے، میرے ان سوالوں کی دھار ہی کند ہو گئی۔ کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے نوکیلے سرے گول ہو گئے۔ اب میرا دل کالے کوٹھے والے کے دربار میں کھڑے ہو کر کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ کا علم بغاوت بلند نہیں کرتا۔ ''اچھا تیری مرضی'' کہہ کر نمانوں کی طرح چپ ہو رہتا ہے۔ وہ ہر چہرے، ہر دروازے کو کھٹکھٹا کر پوچھنا، کوئی ہے جو میری رہنمائی کرے، وہ تلاش کی دیوانگی، وہ بلا کا اضطراب، وہ شدت کی آندھی، وہ غصے کا غبار، وہ تلخی کا طوفان تھم سا گیا ہے۔ زندگی سرکاری مکان کے بغیر بھی قابل قبول اور گوارا سی لگتی ہے۔ جب بھی حساب کم وبیش کے چکر میں پڑتی ہوں تو نجانے کیسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ فائدے کا پلڑا بھاری ہے۔ عطائیں زیادہ ہیں۔ شکوے کا محل ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔

مفتی جی نجانے کتنوں سے یہ ہاتھ کر گئے ہیں۔

-☆-

صغیرہ بانو شیریں

مفتی جی

اسلام آباد کے قبرستان میں کھڑی تھی۔

آسمان صاف تھا فضاؤں میں شبنم کی پھوار کھلی تھی۔ ایسے لمحے ہوا بھی ریشم ریشم تھی، جو تازہ بنی ہوئی مٹی کی قبروں کو پیار سے چھوتی اور دھیمے سے آگے اور آگے چلی جاتی۔ دور کہیں اگر اور عود کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جو ہوا کے دوش پر لہراتی مُسکاتی شام جاں کو معطر کرتی ایک لمحہ کیلئے محسوس ہوتی پھر غائب ہو جاتی۔ زندگی بھی کیا گورکھ دھندہ ہے؟ رنگ و بو کی حسین دنیا کے جال سے نکل کر شہرِ خموشاں میں بسنا اور وہ بھی قیامت تک کیلئے چاہنے والوں کیلئے ایک ایسا دکھ ہوتا ہے جو بوند بوند کر کے تمام عمر رستا رہتا ہے۔

مراحل انسان کیلئے بعض دفعہ عذاب بن جاتے ہیں۔ زندگی اتنی بوجھل ہو جاتی ہے کہ اس کا بوجھ سہارا بن جاتا ہے۔ شاید مرنے کے بعد یہ سارے بوجھ اتر جاتے ہوں۔ جسم و جاں کی موجودگی ایک سراب ہے۔ کبھی موجود، کبھی ناموجود، کبھی موجود۔ کبھی ادھورا، کبھی لبریز، کبھی رلا دے اور کبھی تڑپا دے، یہ سب کچھ کیا ہے؟ چند لمحوں کے لئے میں سوچتی رہی پھر میں نے ہاتھ اٹھائے۔ آنکھیں بند کر کے فاتحہ پڑھی۔ یکدم ایک خنک سی لہر نے مجھے اپنے احاطے میں لے لیا۔ ٹھنڈک اور طمانیت دھیرے دھیرے میرے جسم میں اترتی جا رہی تھی۔ ایک لمحہ کیلئے میں خود چونک گئی۔ تازہ مٹی کے ڈھیر کے پاس مفتی جی اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے تھے اور میری طرف دیکھ کر ہنسے جا رہے تھے۔ ان کا چہرہ صاف شفاف تھا چہرے کی سلوٹیں دور ہو چکی تھیں، ان کی آنکھوں میں وہی چمک تھی۔ ہیرے کی کنی والی، جو دوسروں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ ہیرے کی کنی زور سے چمکی اس کی چمک دمک میں مفتی جی

نمایاں نمایاں تھے۔ معلوم نہیں کتنے لمحے بیتے۔ اوپر نیلا آسمان تھا اور نیچے میں تنہا کھڑی تھی۔ قبروں کے درمیان اور سامنے مفتی جی بیٹھے تھے۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ پہلے سے زیادہ تروتازہ ہوں۔ موت نے انہیں گلے لگا کر جیسے امر کر دیا ہو۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔ بس دیکھتی رہی اور وہ ہنستے رہے، پھر غائب ہو گئے۔ میرے دونوں ہاتھ دعا کیلئے اٹھے تھے۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اب سامنے کچھ بھی نہ تھا سوائے مٹی کے ڈھیر کے اور پھولوں کے، کچھ پھول مرجھا چکے تھے اور چند کلیاں مسکا رہی تھیں۔

اسلام آباد کے قبرستان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ۔ رنگ بکھیرتا ہوا۔ اندھیرے کو ہٹاتا ہوا۔ روشنی بکھیرتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کہیں میرے اپنے حواس کا فشار تو نہیں۔ میرے اعصاب کا خلفشار یا نظروں کا دھوکہ تو نہیں۔ یہ سوچتے ہی پھر کھلی آنکھوں کے سامنے قبر کے اوپر بیٹھے ہوئے مفتی جی نظر آ گئے۔ انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ان کا ناتواں جسم لرز کر رہ گیا اور پھر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

مجھے ایسا لگا وہ زبانِ خموش سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ پھر میں وہاں نہیں ٹھہری۔ سلام کیا اور واپس ہوئی۔ میرا دل بڑا مطمئن تھا اور مجھے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ مفتی جی جہاں بھی ہیں جیسے بھی ہیں خوش ہیں اور یہی میرے لئے بہت تھا۔ ایک لمحے کیلئے میرے دل سے دعا نکلی میری کوئی ذات نہیں، صفات نہیں، حال نہیں، مقام نہیں، اے میرے رب بس میں تیرے ہی در کی محتاج ہوں تو رحیم ہے رحم کر دے کریم ہے کرم کر دے۔

مفتی جی کی وفات کی خبر مجھے فوراً ہی مل گئی۔ میں نے اچانک ڈاکٹر اشفاق حسین کو اسلام آباد فون کیا تو وہ میری آواز سنتے ہی کہنے لگے۔ آج میرا برسوں پرانا یار، ساتھی ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اکیلا رہ گیا مفتی اب نہیں رہا۔ یہ سنتے ہی میں پریشان ہو گئی۔ باوجود کوشش کے اسلام آباد نہ جا سکی۔ اگلے روز گئی تو مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ قل ہو چکے تھے۔ مفتی جی کی بیگم کو دیکھ کر رو پڑی ان کے ہاتھ میں چاولوں کی پلیٹ تھی۔ میرے ہاتھ میں تھما کر کہنے لگیں۔ تجھے معلوم ہے جب میں کسی کے مرنے میں جاتی تھی تو مفتی کہتا تھا۔

تھوڑے چاول ضرور لانا۔ اسے چاول پسند تھے۔ لے یہ پکڑ اور کھا وہ تو چلا گیا اس کی روح خوش ہوگی۔ ایک طرف عکسی انجانے مردوں کے بیچ میں بیٹھے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی فنکشن ہو۔ لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ رو رو کر دو تین لڑکیوں کا برا حال تھا۔ میں یہاں سے فارغ ہو کر ڈاکٹر اشفاق صاحب کے پاس گئی اور کہا۔ دو تین دوا کی پڑیاں بنا دیجئے۔ لڑکیاں بہت رو رہی ہیں۔ اشفاق صاحب بولے۔ تم کس کس کی دوا بنواؤ گی۔ پتہ نہیں کتنی عورتیں اس وقت مفتی کو بیٹھی رو رہی ہیں۔ چپ کر جاؤ ان کے حال پر چھوڑ دو۔

مفتی جی سے میری آخری ملاقات بانو آپا کے گھر ہوئی۔ حسب عادت مجمع لگائے بیٹھے تھے۔ بس ایک بات عجیب لگی کہ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی میں رہ نہ سکی۔ آخر عمر میں آپ نے یہ کیوں سنبھال لی۔ بولے: ''یہ پروفیسر کی وجہ سے ہے۔ ورنہ میں کہاں یہ کام کرنے والا تھا۔'' تصویریں اتر رہی تھیں۔ انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ دی۔ ایک تصویر تسبیح کے ساتھ ہو جائے۔ میں نے کہا۔ مفتی جی کا رنگ اڑ گیا۔ نہ بابا نہ۔ اللہ میاں کے ساتھ نہیں چلے گا۔ پھر آہستہ آہستہ مجمع چھٹتا چلا گیا۔ بانو آپا سب کی خاطر میں لگی ہوئی تھیں اس کے بعد انہوں نے کھانا میز پر لگا دیا۔ یہ آخری کھانا تھا جو میں نے مفتی جی کے ساتھ کھایا۔ مفتی جی ہنسے جا رہے تھے کہ میں اسلام آباد کے لوگوں کو دھوکہ دے کر آیا ہوں۔ وہ آج میری سالگرہ منا رہے تھے۔ دھوم دھام سے اور میں یہاں بیٹھا ہوں۔ وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ پتہ نہیں کون کیک لے کر آیا تھا۔ کھانے کے بعد کیک کاٹا اور یوں سالگرہ من گئی۔ میں تھی، مفتی جی تھے، بانو آپا تھیں اور اشفاق صاحب تھے۔ اس دن میں کافی دیر مفتی جی کے ساتھ رہی۔ کتنی باتیں کیں۔ سچی سچی کھری باتیں۔ انجانے بابوں کی باتیں۔ خوابوں کی باتیں۔ مفتی جی کہنے لگے۔ بہت دن سے ایک ٹھہراؤ ہے۔ اس ٹھہراؤ میں کچھ نہیں نظر آتا۔ پہلے مجھے خواب نظر آتے تھے اب تو یہ سلسلہ بند ہے۔ کبھی کبھی وحشت ہونے لگتی ہے۔

میں نے کہا خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ آپ نے نجانے کتنے خواب دیکھے اب شاید آپ کو تعبیر ادھوری رہ جانے کا خوف دامن گیر ہے۔ تکمیل نہ ہو تو خواب بھی زنجیر بن جاتے

ہیں۔ رفاقت اتنی حسین نہیں ہوتی جتنی جدائی جان سوز ثابت ہوتی ہے اور رکاوٹ ہوتی اس لئے ہے کہ کھلنے کا احساس ہو۔ آگے اور آگے بڑھتے جانا ہی کامیابی نہیں ہوتی بلکہ رکاوٹ کا احساس منزل تک پہنچنے میں مدد کرتا ہے۔ پھر ایک دم میں نے سوال کیا۔ سچ سچ بتایئے آپ کو کبھی موت سے ڈر لگا؟

زندگی میں مجھے بہت کچھ ملا۔ لوگوں کی رفاقت اور اپنائیت نے مجھے کبھی احساس نہیں ہونے دیا کسی محرومی کا۔ میں نہیں ڈرتا بلکہ میں تو بستر بوریا باندھے بیٹھا ہوں۔ میرا جوڑ جوڑ ہل چکا ہے میرے اعضاء کہتے ہیں اب بس کرو۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آرام مجھے یہاں نہیں مل سکتا۔ میں تھک گیا ہوں۔ گاڑی کا انتظار ہے کب آ کے مجھے لے جاتی ہے۔ مفتی جی بولے۔

اس لمحے میں نے چونک کر مفتی جی کو غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے کی ہر سلوٹ میں تھکن کا اظہار تھا۔ چہرے پر یاسیت اور تاسف کی دھند چھائی تھی۔ ہم ایک ہی حوالے سے آدمی کو شناخت کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ زندگی گوناگوں ہے۔ کہیں نہ کہیں انسان چند لمحات کیلئے باوجود ضبط کے چھلک پڑتا ہے۔ یہ چھلکن ہی زندگی ہے اور بس۔

مفتی جی سے ”بابے“ کی بات کریں تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ مزہ لے لے کر سنتے ہیں۔ انہوں نے کسی ”بابے“ کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس سے مانگا بھی اس طریقے سے ہے کہ بن لئے نہیں چھوڑا۔ حضرت دمڑی شاہ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو کہا۔ حضرت میاں محمد کو قلم عنایت فرمایا تھا کچھ مجھے بھی عطا ہو جائے۔ دلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں گئے تو حضرت امیر خسرو کی دہائی دے کر جھولی پھیلا دی۔ سرکار آپ نے ان کی جھولی بھری مجھے بھی دان دیجیے۔ میں مانتا ہوں وہ اہل تھے میں نااہل ہوں لیکن عطا میں اہل ہوتا ہے نہ نااہل بلکہ دین بھی بچی دین بن جاتی ہے پھر حاجی صاحب کا ذکر آتا ہے تو مفتی جی کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ دیکھ اس نے کہا تھا نا۔ آپ اچھے لوگوں سے ملیں گے، سچ کہا تھا نا۔

قدرت اللہ شہاب صاحب کا ذکر کرتے ہیں تو خود منہ بنا کر کہتے ہیں میں پورے تیس

برس دریا کے کنارے بیٹھا رہا کوئی اور ہوتا تو لبالب چھلک پڑتا۔ مگر میں رہا سوکھا کاٹھ کا کاٹھ۔ لیکن ایک بات ہے شہاب نے میری ساری الجھنیں خود ہی دور کر دیں۔ مرشد ہو تو ایسا۔ بغیر کہے سارے کام ہو جائیں۔ بچیوں کا مسئلہ تھا میں شادی کیلئے ذرا پریشان نہ ہوا سارے کام خود بخود ہوتے چلے گئے۔ یہ میرے آقا کا کرم ہے اور بزرگوں کی دین۔

مفتی جی ہسپتال میں بیمار پڑے تھے میں ہر ہفتہ لاہور سے اسلام آباد ان کو دیکھنے جاتی تھی۔ ہسپتال سے انہوں نے خط لکھا اور کہا حضرت یعقوب زنجانی ؒ کے مزار پر جا اور میرا حال سنا۔ پھر مجھے جواب دے۔

اس دن میں پہلی بار حضرت یعقوب زنجانیؒ کے مزار پر گئی۔ مفتی جی کا خط میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے کہا۔ حضرت پہلی بار آئی ہوں وہ بھی آپ کے چاہنے والے کا پیغام لے کر۔ وہ پریشان ہیں، نہ کتاب مکمل ہوتی ہے اور نہ ہسپتال سے جان چھوٹتی ہے اور مفتی جی کہتے ہیں جب تک تحریر میں اثر نہ ہو کتاب بیکار ہے وہ اثر مانگتے ہیں پھر میں نے فاتحہ پڑھ کر ہاتھ اٹھائے۔ میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ جب دعا کر چکی تو میں نے دیکھا گلاب کی تین تازہ پتیاں میری ہتھیلی پر سرخ جگ مگائے یاقوت کی طرح دمک رہی تھیں۔ میں پیچھے ہٹی، ٹشو پیپر میں احتیاط سے پتیاں رکھیں۔ باہر آئی تو ایک جوان خوبصورت لڑکی دودھ کی گڑوی لئے بیٹھی تھی۔ ایک طرف نیاز کی پتیلی دھری تھی۔ میں نے جوتیاں پہنیں تو اس نے اٹھ کر میرا راستہ روک لیا۔ کہنے لگی، صرف ایک منٹ ٹھہر جائیں نیاز چکھ لیں۔

میں نے کہا، کس بات کی نیاز ہے۔ وہ کہنے لگی بچے کیلئے نیاز مانی تھی۔ بچہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ نے جھولی بھری ہے تو آج آئی ہوں اس کی گود میں خوبصورت بچہ مسکرا رہا تھا۔ گھر آ کر میں نے مفتی جی کو خط لکھا اور یہ پتیاں خط میں رکھ کر بھیج دیں۔ میں نے لکھا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور کتاب بھی مکمل ہو گی۔ اس میں اثر بھی ہو گا۔ تینوں باتوں کا جواب مل گیا ہے۔

ایک بار میں مفتی جی کے بیڈ روم میں بیٹھی تھی۔ مفتی جی نیچے کونے میں کاغذات کی ڈھیری لگائے حسب عادت کچھ تلاش کر رہے تھے۔ یکدم بولے۔ شہاب یوں تو میرے

ساتھ ہوتا ہے مگر میرا دل چاہتا ہے ویسے بھی چکر لگایا کرے۔ پتہ نہیں وہ آتا ہے یا نہیں۔
یہ کہنے کی دیر تھی کھڑکی میں سے خوشبو کا جھونکا آیا۔ میں سوچنے لگی یہ کیسی عجیب خوشبو ہے جو پہلے کبھی نہیں آئی۔ دو تین منٹ تک وہ خوشبو کمرے میں چکراتی رہی پھر ختم ہوگئی۔ لاہور آ کر ایک صاحب کشف سے میں نے پوچھا اسلام آباد میں اس وقت کون آیا تھا۔ انہوں نے دیکھ کر جواب دیا اور کہا قدرت اللہ شہاب تھے۔ میں نے مفتی جی کو خط لکھا اس دن آپ کے شہاب صاحب تشریف لائے تھے۔ ہوگئی آپ کی تسلی۔ لاہور میں جب مفتی جی سید سرفراز احمد شاہ صاحب سے ملے تو بڑے متاثر ہوئے۔ شاہ صاحب نے صندل کا پرفیوم منگایا اور کھڑے ہو کر ان پر چھڑکنے لگے۔ میں ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ خوشبو بکھر رہی تھی۔ ارے اللہ اتنی خوشبو۔ اتنی نظر، یہ برداشت کر لیں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ شاہ صاحب ہٹ گئے۔ آتے وقت انہوں نے جوس کا پیکٹ اور رومال مفتی جی کو دیا۔ دہلیز پار کرتے ہی مفتی جی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ شرارتی بچے کی طرح بولے۔ لو جی، ہم تو جہاں جاتے ہیں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔

اگلی دفعہ جب میں اسلام آباد گئی تو کہنے لگے۔ میں تو کہیں آتا جاتا نہیں۔ اب تو "بابے" یہیں آنے لگے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے قرآن شریف اور کتابیں دکھائیں جو کہ ان کے پاس خود بخود ہی "تلاش" کیلئے چلی آ رہی تھیں۔

اللہ سے ان کی دوستی پکی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ باتیں کرتے تھے خود کہتے۔ ۱۹۵۵ء سے یہ دوستی قائم ہے۔ دکھ سکھ اسی سے کہتا سنتا ہوں وہ مجھے حوصلہ دیتا ہے۔
ایک بار ایسا ہوا میں مفتی جی کو خط نہ لکھ سکی کافی دن گزر گئے۔ پھر ان کا لمبا چوڑا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا تیرے دوستوں کا دوست مجھ سے ناراض ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تو کیوں نہیں اسے خط لکھتا۔ یہ خط میں نہیں لکھ رہا وہ مجھ سے لکھوا رہا ہے۔ اب تو میرے سے ناراض نہ ہو اور جلدی سے مجھے خط لکھ۔

ایک بات کی آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا رام جی کی سیتا اور رادھا ہیں اور مفتی جی بھی۔ صبح اٹھ کر خط لکھا اور پوچھا۔ آپ مجھے یہ بتایئے

کرشن جی کی گوپیوں کے ساتھ بھی دوستی تھی اور یہ سیتا اور رادھا جی کا کیا چکر ہے؟

مفتی جی یہ بات ٹال گئے۔ اگلی دفعہ جب میں ان سے ملی تو بہتیرا پوچھا ایک ہی جواب دیتے رہے۔ تو جا کر ان سے پوچھ لے۔ مجھے کیا پتہ وہ کیوں آئی تھیں۔ میں نے سب کا ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے۔

آپ نے دیکھا ہے سیتا جی کو۔ میں نے پوچھا۔

ہاں تصویر میں دیکھی ہیں۔ چھوڑ تو اس قصہ کو اور کوئی بات کر۔ اچھی سی۔ مفتی جی کو بات بدلنے کا ڈھنگ نرالے طریقے سے آتا ہے۔ بھری محفل میں بات کو نیا موڑ اس طریقے سے دیتے ہیں کہ محفل گرما جاتی ہے اس کے بعد ان کی آنکھوں میں چمک کی لہر نظر آتی ہے اور وہ چمک بڑھ کر ساری محفل کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔ یہی ان کا خاصہ ہے۔ کہاں بھی ہوں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ میں ایک بار ان کیلئے مضمون لکھا۔ دیکھ کر کہنے لگے مجھے یہ بہت اچھا اور منفرد لگا۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولے۔ اس مضمون میں اگر میری برائیاں بھی شامل ہوتیں تو اور اچھا ہو جاتا۔ مفتی جی کی ڈیوٹی جب ''تلاش'' لکھنے پر لگی تو ایک بار میں نے ان سے کہا مفتی جی یہ تو پکی بات ہے نا جب تک تلاش مکمل نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی سے نوازے گا آپ یوں کریں تلاش مکمل نہ کریں۔ رہنے دیجئے۔

مفتی جی خاموش ہو گئے۔ کہنے لگے۔ میں لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ مجھے تصوف کے بارے میں علم تھا۔ پتہ نہیں یہ ڈیوٹی کیوں لگ گئی۔ ایک ''بابے'' نے نہیں مجھ سے کئی ''بابوں'' نے مختلف اوقات میں آ کر ''تلاش'' لکھنے کو کہا ہے۔ میں حیران ہوں یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آرام نہیں کرنے دیا جا رہا بلکہ میری ڈیوٹی لگا دی گئی ہے کہ یہ کام تمہیں ہی کرنا ہے۔

مفتی جی اپنی ذات کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔ ہندیاترا میں لکھتے ہیں؛

میری ذات میں ایک بت ہے۔

میرے سجدے شور و شغف کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میری سرشاری عام دربار میں رنگ نہیں لاتی۔

میری مانگ آواز کی محتاج نہیں۔

میری لگن اپنے اظہار کیلئے اشارے ڈھونڈتی ہے۔وضاحت کی متحمل نہیں ہوتی۔

میری دعا ایک منت ہے۔ایک ترلا ہے ایک بنتی ہے بے آواز، بے الفاظ، رنگ بدلتے رہتے تھے۔جب وہ کسی ''بابے'' کے حضور میں ہوتے تو تقدس کے نشہ میں ایسے لت پت ہوتے جیسے رس گلا شیرے میں ڈوبا ہوتا ہے۔جب اپنے دوستوں میں بیٹھے ہوتے تو چہرے پر شرارت ہوتی۔بات بے بات پر۔کھل کر ہنستے۔جب کسی دکھی عورت کو مشورہ دے رہے ہوتے تو ایسا لگتا ساری دنیا کا درد انہی کے جگر میں ہے۔کوئی ہومیو پیتھک دوا لینے آتا تو وہ پڑیا باندھ کر ایک لمحے کیلئے بڑی عقیدت سے دیکھتے پھر پڑیا تھما دیتے۔اللہ سے بھی یہ معاہدہ کر رکھا تھا جس کو شفا دینی ہے اس کو بھیج اور کسی کو نہ بھیج۔

تصوف کے بارے میں کتابیں پڑھ رہے ہوتے۔تو چہرہ سپاٹ ہو جاتا۔حیرانی سے حیرانی ہوتی۔ان کا آخری رنگ تسبیح پڑھتے میں نے دیکھا چہرے پر پڑی سلوٹیں گہری ہوتی جارہی تھیں۔جیسے کسی پہاڑ میں دراڑیں پڑ رہی ہوں۔

خوبصورت چہرے دیکھ کر علی پور کا ایلی جاگ اٹھتا۔آنکھ کی جوت بڑھ جاتی۔الفاظ کی دھار سان پر رکھی جاتی۔سامنے بیٹھی خاتون پے در پے وار سے گھبرا جاتی اور پھر ایلی یکدم ممتاز مفتی بن کر سامنے آتا۔ بڑے ٹھہراؤ اور اعتماد کے ساتھ۔اپنے سحر کے حصار میں لینے کا گر خوب آتا تھا۔یہ گر وہ خواتین پر بھی نہ آزماتے بلکہ ادب وآداب کے دائرے میں ڈوب کر سر جھکا کر وہ ''بابے'' کے حلقے میں ایسے ''جی حضوری'' بنتے کہ ''بابا'' بھی پشیمان ہو کر کچھ نہ کچھ دان جھولی میں ڈال ہی دیتا۔ اسلام آباد کی بادشاہت ملی جب بھی چھیڑ خانی سے باز نہ آئے۔خود ہی ہنس کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔

اب میں سوچتی ہوں مفتی جی ایک گھنیرے درخت تھے۔جس کی چھاؤں میں رک کر انت گنت بندوں نے سانس لیا اور آگے بڑھ گئے۔ان کا یہ سایہ ہی دوسروں کو سکون بخشتا تھا۔یہ آدمی پر ہی منحصر تھا کہ اس کے اپنے اندر کتنی تپش ہے۔کتنی دھوپ سہاری ہے اور وہ

کتنی دیر سائے میں بیٹھ سکتا ہے۔ درخت کو اپنی چھایا دے کر کتنا سکون ملتا ہے۔ یہی سکون شاید ان کو اپنی منزل کی طرف دھیمے دھیمے لے جاتا تھا۔ وہ لوگوں سے بیزار نہیں ہوتے تھے۔ کسی ایک شخص کی یافت سے نمٹنے نہ پاتے دوسرا آ جاتا۔ وہ کنارہ نہ کرتے۔ بلکہ اپنا دائرہ تھوڑا سا بڑھا لیتے۔ تا کہ آنے والے کو دھوپ کا احساس نہ ہو۔

نہ ان کو اپنی منزل کے ٹھہرنے کا احساس تھا اور نہ اپنے منتشر ہونے کا۔ نہ انہیں اپنے خوابوں کی تعبیر ادھوری رہنے کا خوف تھا اور نہ اس بات کا کہ کون کس درجہ کمال پر فائز ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقے میں جو بھی لوگ ہیں وہ سب ان سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ کھرا پیار۔ خلوص کی کسوٹی پر۔ جس میں کوئی کھوٹ نہیں۔

آج بھی درخت کا وہ سایہ گزرتے وقتوں پر محیط ہے۔ ان کی باتیں، ان کی یادیں دل کی گہرائیوں میں محفوظ ہیں جو بھی ان کی چھایا میں آیا وہ ان کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مفتی جی کا سحر ہے، جادو ہے، جس کے اثر سے نکلنا آسان نہیں۔

-☆-

جاوید چوہدری

سیدھی لکیر ٹیڑھی لکیر

ممتاز مفتی ہمالیہ ہے۔

اس سے دور رہنے والا سکھی، نہ قریب رہنے والا خوش، جو دور ہے وہ ہر وقت ''روزے دی جالی چمن لین دے'' کا ورد کر رہا ہے اور قریب رہنے والا ''یا اللہ بچا'' کی تسبیح کر رہا ہے لیکن وہ ہمالیہ کی طرح ایستادہ ہے خاموش باوقار سیدھا۔ نہ دوری کا غم نہ قربت کا اندیشہ جو قریب ہے اس سے لاتعلق اور جو دور ہے آس لگائے بیٹھا ہے اس سے ناآشنا کوئی آ جائے آ جائے کوئی اُٹھ کر چلا جائے چلا جائے، آنے والے کا سواگت کرے گا نہ جانے والے کو روکے گا۔ اس کے سامنے چائے کا ایک کپ دھرا ہے چپ چاپ اُٹھ کر پی جائے گا اور سامنے شخص کو جھوٹے منہ تک سے نہیں پوچھے گا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی تو پیکٹ سے سگریٹ نکال کر لگائے گا اور مزے سے ناک منہ سے دھواں اگلنے لگے گا پر مجال ہے، جو دوسرے کو سگریٹ پیش کر دے۔ پوچھیں تو آنکھ مار کر کہے گا میں منہ پھٹ ہوں اور منہ پھٹ لوگوں کو پسند کرتا ہوں، جسے طلب ہے وہ کہے چائے ہوئی تو پیش کر دوں گا نہ ہوئی تو افسوس میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کروں گا اور کہنے والا کھسیانی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ ممتاز مفتی ہمالیہ جو ہوا۔

جو ممتاز مفتی کو پڑھتا ہے وہ کہتا ہے مفتی یہ ہے لیکن جو ملتا ہے وہ کہتا ہے نہیں ممتاز مفتی وہ نہیں یہ ہے۔ یہی سوال جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو وہ مزے سے کہتا ہے صاحب نہیں میں نہ وہ ہوں اور نہ یہ بلکہ میں دھوکہ ہوں۔ جب میں ایلی ہوتا ہوں تو اس وقت میرے اندر ممتاز مفتی قہقہے لگا رہا ہوتا ہے جب ممتاز مفتی بن کر تخت پر بیٹھتا ہوں تو میرے اندر ایلی

بغلیں بجا رہا ہوتا ہے جب میں ممتاز ہوتا تو میں اس وقت ممتاز نہیں ایلی ہوتا ہوں اور جس وقت ایلی ہوتا ہوں اسوقت ایلی نہیں ممتاز ہوتا ہوں۔ حیرت اب کیا کہئے کیا سمجھئے یہ ڈور ہے یا الجھاؤ سمجھنے لگیں تو الجھ جاتے ہیں۔ الجھنے لگیں تو سمجھ جاتے ہیں اکثر ایسا بھی ہوا کہ کوئی ممتاز مفتی سے ملنے گیا اور اس کا پالا ممتاز مفتی سے پڑ گیا اب بھگتو، جب ممتاز مفتی بول رہا ہو تو ایمان کی دستار پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے ''اللہ تعالی بچہ ہے لاکھ گناہ کرو شرک کرو حکم عدولی کرو جب احساس ہو جائے سر جھکا کر کھڑے ہو جاؤ وہ فوراً خوش ہو جائے گا'' اللہ تعالی سے بچ کر رہو اگر اسے تمہاری کوئی ادا پسند آ گئی تو جھپا ڈال لے گا پھر گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے'' اور ہنس کر کہتا ہے'' اللہ تعالی تو ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ میرے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے چلتا پھرتا ہے میں تو اس سے تنگ آیا بیٹھا ہوں''۔ یہ سب کچھ ممتاز مفتی بغیر ڈرے جھجکے رُکے کہہ جاتا ہے، اور کیوں ڈرے؟ کس سے جھجکے؟ کہاں رکے؟ کیونکہ وہ ہمالیہ جو ہوا اور ایلی، اس کے سامنے بیٹھنے سے پہلے ہزار ہزار مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ روایت کہتی اخلاق بچاؤ۔ اخلاق کہتا ہے میری خیر ہے۔ عقل بچاؤ عقل قہقہہ لگا کر کہتی ہے مجھے چھوڑو ذرا دل کو سنبھالو اور جب ایلی بولتا ہے تو بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے یورپ کی عورت نے ننگا ہو کر حسن کھو دیا، کہتا ہے گورے سوچ رہے ہیں نسل کیسے بڑھے گی کیونکہ مردوں کو عورتوں میں کشش ہی محسوس نہیں ہو رہی۔ ممتاز مفتی دانشوروں میں خوش رہتا ہے اور ایلی لڑکے بالوں میں خوب پھلتا پھولتا ہے لیکن اس سے پوچھیں تو وہ کہتا ہے نہیں میں تو دھوکہ ہوں دانشوروں میں ایلی ہوتا ہوں اور نوجوانوں میں ممتاز مفتی اب کیا کہئے چپ ہی رہئے ہم اسے قائل تو نہیں کر سکتے منا نہیں سکتے کیونکہ یہ ہمالیہ جو ہوا۔

ممتاز مفتی جسے ناپسند کرتا ہے اس کے سامنے سراپا عجز بن جاتا ہے دشمن کو پیار سے بلائے گا مسند پر بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرے گا کنگھی پٹی کر کے اس کی آنکھوں میں سرمہ لگائے گا پھر ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا مہاراج سارے جہاں میں آپ ہی ہیں آپ کا یہ داس آپ کے سامنے کیا ہے، ہاتھی کے سامنے چیونٹی اور جب دشمن کا سینہ غرور سے پھول جائے گا گردن فخر سے تن جائے گی تو مفتی کو ایک عجیب تسکین محسوس

ہوگی جو صرف مفتی کو محسوس ہو سکتی ہے کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں لیکن جب مفتی کسی سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے پیچھے ڈنڈا لے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے اسے خوب ڈانٹے گا بھری محفل میں اس کی بے عزتی کرے گا نکتہ چینی کرے گا اور بات بات پر بگڑے گا اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ شخص اس سے ناراض ہو جائے ۔ بھاگ جائے دور ہو جائے اور ہاں ایک اور بات جس سے جتنا اختلاف ہو گا اسے اتنا ہی دوست سمجھے گا۔ خود کہتا ہے وہ فکری طور پر اشفاق احمد اور بشیر کا سخت دشمن ہے لیکن پچھلے چالیس برس سے وہ جب بھی لاہور گیا صرف انہی دونوں کے گھر ٹھہرا، پوچھا جائے تو کہے گا میں کسی دوسرے کے پاس ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ ہے نہ ٹیڑھی لکیر، پر ہم کیا بگاڑ سکتے ہیں کیونکہ یہ ہمالیہ جو ہوا۔

ممتاز مفتی پچھلے ۶۰ برسوں سے لکھ رہا ہے ان ۶۰ برسوں میں اسے پڑھنے والوں کو اردو آ گئی لیکن وہ آج تک اردو نہ لکھ سکا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے آج تک اردو ادب نہیں پڑھا اسے اردو سرے سے نہیں آتی ۔ وہ صبح بیدار ہونے سے رات سونے تک پنجابی بولتا ہے انگریزی ادب پڑھنے کی وجہ سے ہمیشہ انگریزی میں سوچتا ہے لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو سوچ ایک اجنبی زبان میں ترجمہ ہو کر کاغذ کا حصہ بن جاتی ہے۔

جو اس کی اپنی ایجاد کردہ ہے وہ زبان کیا ہے اسے صرف ممتاز مفتی کے چاہنے والے جانتے ہیں کیونکہ وہ چاہت سادگی ابلاغ اور احساس کی زبان ہے۔ مفتی نے ہمیشہ کہنے کے لئے نہیں پہنچانے کے لئے لکھا چنانچہ اس کا ایک ایک لفظ وہاں پہنچ گیا جہاں اسے پہنچنا چاہئے تھا اس نے کبھی لکھ کر نہیں کاٹا کیونکہ اس کا خیال ہے اس سے بات کا فطری پن مجروح ہوتا ہے، بات وہ نہیں رہتی جو اسے ہونا چاہئے اس لئے ممتاز مفتی کہتا ہے اس نے ادیب بننے کے لئے اپنے لئے لکھا لہذا جو پڑھے اس کا بھلا جو نہ پڑھے اس کا بھی بھلا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ممتاز مفتی کہنے سے قبل اس پر کچھ پڑھ کر پھونکتا ہے اس لئے اس کے فقرے آگ ہوتے ہیں ایسی آگ جو اندر کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور راکھ بھی وہ جس میں ہر لمحہ چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں ۔ اسے پڑھنے والا یا اس کے قریب رہنے والا وہ نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے میں نے خود کئی لوگوں کو اور ہوتے دیکھا لیکن جب اس سے پوچھا جائے

تو وہ آنکھیں میچ کر کہتا ہے ''میں بابا نہیں ہوں میں نے اپنے بابے سے کہا تھا مجھے بندر بنا دینا لیکن بابا نہ بنانا۔'' مجھے یقین ہے ممتاز مفتی نے اپنے بابے سے یہ ضرور کہا ہوگا کیونکہ اگر یہ شخص اس طرح بات نہ کرتا تو ممتاز مفتی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے بابے نے اس درخواست کو حکم الٰہی سمجھا ہو لہذا لوگوں کو ممتاز مفتی میں وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو بابوں میں ہوتا ہے یا پھر بابوں میں ہونا چاہیے۔ تاثیر کی بھیگ برابری کا مزار اور کبھی کبھار کشف کے چھینٹے اس میں سب کچھ ہے۔ لیکن کون ہے جو اس سے یہ راز اگلوا سکے کیونکہ ممتاز مفتی ہمالیہ ہے اور ہمالیہ کا کام راز اگلنا نہیں دفن کرنا ہے۔

ممتاز مفتی کا نام ممتاز ہے لہذا اس کی شخصیت سے انوکھا پن نکال دیا جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ اس کی ہر بات نرالی ہے اسے کوئی ابا نہیں کہتا۔ بچے تو ایک طرف رہے پوتے اور نواسے تک یار کہہ کر اسے مخاطب کرتے ہیں۔ اسکا کہنا ہے کہ وہ پاکستان بننے سے قبل باپ بن چکا تھا لیکن یہ حرکت جسم کی حد تک محدود رہی کیونکہ وہ آج تک ذہنی طور پر باپ نہ بن سکا اس کا بیٹا جوانی میں اس سے وہ ہر بات بہانگِ دہل کہہ دیتا جو عموماً نوجوان اپنے قریبی راز دار سے کہتے ہیں اور وہ بھی کان میں۔ اس حرکت کو بعد میں پیدا ہونے والے بچوں نے خاندانی روایت جانا لہٰذا آج اس کے پوتے اور نواسے اس سے ان ''دوطرفہ امور'' پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں جن کا کوئی باپ متحمل نہیں ہوسکتا لیکن کیا کیا جائے ممتاز مفتی اپنی عمر کے ہاتھوں مجبور ہے کیونکہ جب یہ ۱۶ سال کا تھا تو اس کا جذباتی ارتقاء رک گیا تھا آج اس سانحہ کو ۷۴ برس گزر چکے ہیں وہ اپنی جوانی کو اس طرح اٹھائے لئے پھرتا ہے جس طرح ہابیل قابیل کو مارنے کے بعد لئے پھرتا تھا۔ اس کی محفل میں کسی دور میں جنریشن گیپ مسئلہ نہیں بنا اور ہر دور میں نوجوان اس کے یار رہے آج سے پچاس سال پہلے بھی اور اب بھی۔ دوسروں کے برعکس (جن میں تارڑ سمیت بے شمار لوگ ہیں جو دوسروں کے بچوں کو ''خراب'' کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں) ممتاز مفتی کا پہلا وار ہمیشہ اپنے گھر پر چلا۔ عکسی جب جوان ہوا تو ممتاز مفتی نے اسے فوراً کرپٹ کر دیا اسے سارا دن کراچی کی سڑکوں پر لئے پھرتا فلموں کی ترغیب دیتا شرطیں لگاتا اور ہر فحش بات پر ہاتھ پر ہاتھ مارتا۔

جب تک عکسی جوان رہا مفتی اس کا سب سے گہرا اور اچھا یار رہا پھر عکسی میں سنجیدگی آ گئی جو عموماً ادھیڑ عمر میں آ جاتی ہے تو ممتاز مفتی نے ایک سعادت مند برخوردار کی طرح اس کا ادب شروع کر دیا۔ اس کی موجودگی میں نہ سگریٹ پیتا اور نہ اونچی آواز میں بات کرتا۔ ''چپ بابا سو رہے ہیں۔'' ممتاز مفتی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پوتوں کو سمجھاتا۔

ان دنوں ممتاز مفتی بہت اُداس رہتا تھا اسے رہنا بھی چاہیئے تھا کیونکہ وہ کون نوجوان ہے، جو ایسے بزرگ کے ساتھ ایک گھر میں سہولت کے ساتھ رہ لے جو ۵۰ برس قبل اس کا بیٹا اور ۳ سال پہلے دوست تھا۔ یہ اداسی فراریت بنی اور ممتاز مفتی گھر سے باغی ہو گیا ان دنوں اس نے اداس نوجوانوں کی طرح دو ایک معاشقے بھی کیے جو روایتی بندشوں کے باعث ناکام ہو گئے۔ چنانچہ مجبوراً صبح کا بھولا شام کو واپس آ گیا لیکن گھر میں اس کے لئے سرپرائز تھا۔ اس دوران اس کے پوتے جوان ہو چکے تھے۔ ممتاز مفتی اپنے ہم عمر دیکھ کر کھل اٹھا۔ اب وہ خوش ہے، محفلیں بجتی ہیں، باتیں بنتی ہیں اور قہقہے لگتے ہیں لیکن جب یہ نوجوان اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو ممتاز مفتی اچانک خاموش ہو جاتا ہے۔ مجھے پتہ ہے یہ خاموشی دانشور ممتاز مفتی کی خاموشی نہیں ایلی کی چپ ہے اور اس وقت ایسی ترکیب سوچ رہا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ ان نوجوانوں کی ''فریز'' کر سکے یہ بڑے نہ ہو سکیں، یہیں رُک جائیں، ان کے چہرے پر شرارت ٹھہر جائے اور ان کے بالوں میں کبھی متانت کا سفید بال نظر نہ آئے کیونکہ اسے خدشہ ہے اگر ایسا ہو گیا تو اس کے گھر میں دو تین بزرگوں کا اضافہ ہو جائے گا جس کے بعد اس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی اسے بیک وقت چار چار بوڑھوں کو سنبھالنا پڑے گا۔ سب کا خیال رکھنا پڑے گا۔ ادب کی وجہ سے کسی کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکے گا اور یہ سب کچھ نوجوانوں کے بس کی بات نہیں اور نوجوان بھی وہ جس کی عمر ۹۰ سال ہو اور خواہ وہ ہمالیہ ہی کیوں نہ ہو۔

-☆-

احمد عقیل روبی

ممتاز مفتی کی یادیں اور باتیں

میں گاڑی سے اتر کر گھر میں داخل ہوا تو میری بیوی نے کہا ''اشفاق احمد صاحب کو فون کرلو، ان کا دو دفعہ فون آیا ہے۔''

میں نے فون ملایا تو اشفاق احمد نے کہا:

''کہاں آوارہ گردی کرنے گئے تھے؟''

''پبلشر کے پاس گیا تھا، علی پور کا مفتی لینے۔''

اشفاق احمد نے چند لمحے خاموشی اختیار کی اور پھر بڑی عجیب سی آواز میں کہا ''مفتی جی فوت ہو گئے ہیں۔'' میں نے محسوس کیا جیسے انہوں نے یہ بات اس آدمی کی طرح کہی ہے جس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو اور وہ نیچے گہری کھائی میں دور تک گرتا چلا جائے۔ صرف ایک ہفتہ قبل اشفاق احمد نے کہا تھا:

''قدرت اللہ شہاب فوت ہوا تو میں ایک بہت ہی شفیق دوست سے محروم ہوا، ممتاز مفتی جائے گا تو میرے پاؤں تلے کی ساری دھرتی سمیٹ کر لے جائے گا۔''

۱۹۸۵ء میں جب میری ماں مری تو میرے اردگرد پھیلا ہرے درختوں کی چھاؤں کا سارا جنگل جل گیا اور سورج نے گن گن کر بدلے لیے۔ دھوپ کے ایسے کوڑے مارے کہ جسم بلبلا اُٹھا۔ میں برگِ خشک کی طرح ممتاز مفتی کے قریب آ کر گرا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ہرے درختوں کی چھاؤں کا سارا جنگل ایک بار پھر میرے اردگرد پھیل گیا ہے اور میں نوخیز ہرنی کے بچے کی طرح دوڑتا پھر رہا ہوں اور ممتاز مفتی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں ایک بار دوڑتا دوڑتا اس کے قریب آ کر بیٹھا تو ممتاز مفتی میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے ''یار روبی

پیارے مجھے صرف ایک دکھ ہے۔"

"کیسا دکھ مفتی جی؟"

"یار تو مجھے بہت دیر میں ملا ہے تو نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، ملا بھی تو اس وقت جب میں جانے کا ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر بیٹھا گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں دُعا مانگتا رہا کہ یا اللہ ممتاز مفتی کو گاڑی میں جگہ نہ ملے، یہ ٹکٹ ہاتھ میں لے کر یوں ہی پلیٹ فارم پر بیٹھا رہے۔۔۔مگر اشفاق احمد کے فون سے پتہ چلا کہ ممتاز مفتی کو گاڑی میں جگہ مل گئی ہے،اور گاڑی اسے لے کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری ماں پھر مر گئی، ہرے درختوں کی چھاؤں والا جنگل پھر غائب ہو گیا، سورج ایک بار پھر گن گن کر بدلہ لے گا اور دھوپ کے کوڑے برسائے گا۔

میں بارش کے آخری قطروں کی طرح ممتاز مفتی کے پاس بہت دیر میں پہنچا۔ عکسی مفتی سے میری شناسائی ایک عرصے سے تھی مگر ممتاز مفتی سے دعا سلام تک نہ تھی۔ میں نے اپنی کتاب "کھرے کھوٹے" بھجوائی تو ممتاز مفتی نے آدھی کتاب پڑھ کر کتاب کی بے حد تعریف کی۔ میں ملنے پہنچا تو ممتاز مفتی کی محبت، شفقت نے بدحواس کر دیا۔ بقول سجاد حیدر، مفتی کی آنکھوں سے ایک محلول میرے دل میں ٹپکنے لگا اور میں داستانوں کے کرداروں کی طرح گنبد مفتی میں بھٹکنے لگا۔ ہوش وحواس درست ہوئے تو میں نے کہا:

"مفتی جی میں آپ پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔"

"اوئے یار خدادا ناں من، میں تے بڑا معمولی آدمی آں۔"

"بس آپ اجازت دے دیں" میں نے ضد کی۔ ممتاز مفتی خاموش رہے۔ میں لاہور آ گیا، ایک ہفتہ خاموش پھرتا رہا پھر کچھ سوچ کر لکھنے بیٹھا تو ایک باب مکمل کر لیا، اس کے بعد قلم کاغذ پر چلنے کیلئے ترس گیا، کئی ہفتے گزر گئے۔۔۔یہ یکم اکتوبر کی بات ہے۔ میں نے اس جمود سے تنگ آ کر جو میرے اندر طاری تھا ممتاز مفتی کو فون کیا۔

"پیرو مرشد کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کیا ہوا روبی پیارے" ممتاز مفتی نے کہا۔

''میں آپ پر لکھنا چاہتا ہوں آپ لکھنے نہیں دیتے، آپ کی خاموشی کاغذ اور قلم کے درمیان دیوار بن گئی ہے اسے گرادیں'' میں نے ساری بات ایک سانس میں کہہ دی۔

''روبی تیرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔'' میں نے فون بند کر دیا اور ممتاز مفتی پر ''علی پور کا مفتی'' نامی کتاب لکھنا شروع کر دی، یہ یکم اکتوبر کی بات ہے۔ اس دوران ممتاز مفتی کی طبعیت خراب ہوتی رہی۔ احمد بشیر اور اُن کی بیوی انہیں دیکھنے گئے۔ میں احمد بشیر سے ملا تو وہ کہنے لگے۔

''اب ممتاز مفتی کے اندر کی ساری طاقتیں کمزور پڑ رہی ہیں، بیماریوں نے مل کر حملہ کر دیا ہے، اللہ اپنا کرم کرے۔''

میں احمد بشیر سے یہ خبر سُن کر بھاگا بھاگا اسلام آباد پہنچا، فون کیا تو ممتاز مفتی کی آواز فون پر بڑی ٹوٹی ہوئی تھی بالکل جولاہے کے دھاگوں کی طرح جو کنگھی میں پھنس کر ٹوٹ جاتے ہیں وہ ان ٹوٹے دھاگوں کو جوڑ کر بولے ''تجھے فون کرنے کی ضرورت نہیں، تو آجا میرے پاس۔''

میں اُن کے پاس پہنچا تو واقعی ان میں وہ تیزی، چستی اور پھرتی نہیں تھی مجھے ایسا لگا جیسے پرانی حویلی کی دیواروں سے پلستر اُتر اُتر کر گر رہا ہے۔ میں اداس بیٹھا تھا، انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا، '' تو فکر نہ کر میں تیری کتاب پڑھ کر مروں گا وعدہ۔۔۔''

انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا میں نے ڈرتے ڈرتے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے دن عکسی مفتی سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے۔ ''روبی ۲۳ اکتوبر کو نیلوفر اقبال، مفتی صاحب کی سالگرہ منا رہی ہے، ۲۳ تک کتاب آجائے تو بہت اچھا ہے''۔ عکسی مفتی چند لمحے کچھ سوچتے رہے اور پھر کہنے لگے ''مفتی صاحب کا اب کچھ بھروسہ نہیں۔''

میں لاہور آ گیا اور '' علی پور کا مفتی'' لکھنا شروع کر دی۔ ۲۰ اکتوبر کو کتاب مکمل ہو گئی، ۲۱ اکتوبر کو میں نے پبلشر کو دی، ۲۲ کی شام کتاب چھپ گئی اور ۲۳ اکتوبر کو ہم کتاب لے کر اسلام آباد کلب چلے گئے۔

کلب میں اسلام آباد کے سارے ادیب اور شاعر موجود تھے۔ احمد فراز، ضمیر جعفری،

شبنم شکیل، مظہر الاسلام،، رشید امجد، منشایاد، جلیل عالی، اکرم ذکی، بیگم سرفراز اقبال، ممتاز مفتی، ڈاکٹر ابدال بیلا اور عکسی مفتی کے ساتھ ۶ بجے کلب آئے ان کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا ۔۔۔ ممتاز مفتی اس ساری کارروائی میں خاموش رہے، بس ایک جملہ ہر کسی سے کہتے تھے:

"بس خوش رہو۔"

چائے کے بعد سب لوگ کرسیوں کا دائرہ بنا کر بیٹھ گئے، ممتاز مفتی اپنی بیوی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے ۔ میں نے کتاب پیش کی تو انہوں نے کتاب لوگوں کو دکھائی اور میری طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا:

"تم ویسے ہی گھبرا گئے تھے، دیکھو میں زندہ ہوں۔"

میں نے "علی پور کا مفتی" میں سے ایک باب "دیوتا بندر کی دم" پڑھا جس میں ممتاز مفتی کی زندگی کے حالات کو دیوتا بندر کی دم کی طرح طویل کہا تھا ۔۔۔ میں نے بات ختم کی تو شبنم شکیل نے کہا،

"کچھ کتاب اور مصنف کے بارے میں ۔" ممتاز مفتی کو ڈاکٹروں نے بولنے سے منع کیا تھا مگر وہ سب ہدایات ایک طرف رکھ کر بولنے لگے (غالباً یہ اُن کی آخری ادبی گفتگو تھی)

"اس آدمی نے شخصیتوں پر خوبصورت خاکے لکھے مگر اسے نام رکھنا نہیں آتا۔ "کھرے کھوٹے" بھی بھلا نام ہے، اس کتاب میں سب کھرا ہی کھرا ہے کھوٹ ہے ہی نہیں۔ اس کا اپنا نام روبی بھی بازارِ حُسن کی لڑکیوں جیسا ہے۔ اس نے پندرہ دن میں مجھ پر کتاب لکھ دی یہ بڑا مضبوط لکھنے والا ہے، آپ اسے آدمی کہہ لیں مگر میں تو اسے دیوتا بندر کی دم کہوں گا۔"

تقریب کے دوسرے دن طبیعت مزید خراب ہوگئی ۔ میں نے فون کیا، طبیعت بدستور خراب تھی ۔ میں لاہور آ گیا۔ ممتاز مفتی تیسرے دن ہسپتال داخل ہو گئے ۔ ۲۷ اکتوبر کو اللہ کے پاس چلے گئے مگر مجھ سے کیا ہوا وعدہ نبھا کر "تو فکر نہ کر میں تیری کتاب پڑھ کر مروں گا۔"

میں اب سوچتا ہوں کاش میں یہ کتاب اتنی جلدی نہ لکھتا دو ایک سال اور دیر کر دیتا۔

-☆-

نیلوفر اقبال

مفتی کی یاد میں

آج ہم ممتاز مفتی کو یاد کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ بھولے تو ہم انہیں کبھی بھی نہ تھے۔ لیکن ممتاز مفتی ٹرسٹ نے ہم سب کو یکجا کرنے کا جو اہتمام کیا ہے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ بس ایک درخواست ہے کہ اس دن کو جیسا کہ کارڈ پر لکھا گیا ''برسی'' کے بجائے مفتی کی یاد میں کہا جائے دراصل لفظ برسی سے سوگ کی بو آتی ہے، جبکہ عکسی نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کا سوگ نہیں منائیں گے بلکہ انہیں سیلیبریٹ کیا کریں گے یہی مفتی جی کی اپنی خواہش بھی تھی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جب ممتاز مفتی ہمارے ساتھ تھے تو ہم رابطہ والے چھوٹے پیمانے پر سہی پر کچھ نہ کچھ سیلیبریشن ان کی سالگرہ کی صورت میں کر لیتے تھے۔ ان کی آخری سالگرہ کو کون بھول سکتا ہے اور ان کی ہمت حوصلے اور زندہ دلی کو کون بھول سکتا ہے کہ اس روز ان کی حالت ٹھیک نہ تھی لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے سالگرہ پارٹی میں شرکت کر کے ہم لوگوں کی خوشی پوری کی۔ وہ ایک بھرپور محفل تھی خود مفتی جی کے چہرے سے بھی خوشی عیاں تھی اور اس دن اُن کی یادگار تصویر بھی کھنچی تھی۔ گویا وہ پارٹی ان کی فیئرویل پارٹی بن گئی۔

Farewell for the most popular man بلاشبہ وہ ہردلعزیز ترین شخصیت تھے۔ حیرت انگیز حد تک زندہ دل اور پُر کشش، یہ کشش نہیں تھی تو کیا تھا کہ ہر کوئی بلا لحاظ عمر یا صنف ان کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا ان کا گھر ایک مرکز کی سی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مفتی کی ذات میں ایک روحانی کشش موجود تھی۔ وہ اسلامی

آدمی تھے یا نہیں اس سوال نے خود انہیں بھی تمام عمر الجھائے رکھا لیکن روحانی آدمی وہ بہر حال تھے۔ان کی شخصیت اور تحریر دونوں اس بات کی گواہ ہیں۔

مفتی جی کی شخصیت کی طرح یہی کشش ان کی تحریر کی ہر سطر میں موجود ہے اور ان کی تحریر کو دوسروں کی تحریر سے منفرد بناتی ہے۔ایک خاص بُنت کے چھوٹے چھوٹے سادہ لیکن دلکش فقرے ایک شگفتگی اور ہیومر۔ہیومر جو کبھی اُبھر کر سطح پر نہیں آیا اور وہ کبھی مزاح نگار ہیومرسٹ نہ کہلائے۔لیکن شگفتگی کی ایک رو عام طور سے ان کی ہر تحریر پر چھائی رہتی ہے اور ایک مخصوص ڈکشن (diction) جو صرف ممتاز مفتی کی تھی کئی ایسی تراکیب جو صرف ممتاز مفتی کے اندازِ بیاں کا خاصا تھیں، مثلا رنگ پچکاری، پھوار، بھگو دینا، چھینٹے اُڑنا ہلکے پھلکے سٹائل میں لکھا ہر افسانہ ایک گھمبیر نفسیاتی سٹڈی ہوتا جو کہ اپنے اندر موجود کرداروں کی روح تک کو کھنگال ڈالتا ہے۔

میں یہاں ''علی پور کا ایلی'' کا ذکر کروں گی ''الکھ نگری'' میں ممتاز مفتی نے اعتراف کیا ہے کہ ''علی پور کا ایلی'' میری خود نوشت ہے جبکہ یہ بطور ناول سامنے آئی تھی اور اسے بہت زیادہ لیکن ایک مخصوص نوعیت کی شہرت حاصل ہوئی خصوصی نوعیت کی اس لحاظ سے کہ گویا یہ جنس نگاری کا کوئی شاہکار ہے لیکن جب میں نے اسے پڑھا تو محسوس کیا کہ لطف ولذت دور کی بات یہ تو ایک شکستہ بچپن اور ٹیڑھی میڑھی (twisted) سی جوانی کی ناآسودگیوں سے لبریز ایک Poignant کی داستان تھی۔بات یہ ہے کہ مفتی کوئی فحش نگاری (pornography) لکھنے والا عام ادیب نہیں بلکہ ادبی افق پر چھایا ہوا دیو قامت ادیب اور نفسیات کے موضوع پر کوئی باضابطہ سند نہ رکھنے کے باوجود ماہر نفسیات دان تھا۔اس کتاب میں عمر کے اُسی دور Growth period کی کتھا ہے، جس سے ہر لڑکا لڑکی گزرتے ہیں۔بات بن جانے کی امید ٹھکرائے جانے کا ڈر۔پکڑے جانے کا خوف کون سا لڑکپن ان تجربات سے خالی ہوگا۔ایک ذاتی زندگی کے واحد تجربے پر مبنی ہونے کی وجہ سے یہ علی پور کا ایلی، سماجی، سیاسی، یا تاریخی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں سے مختلف ضرور ہے لیکن بحیثیت خود نوشت ایک شخصی اور نفسیاتی مطالعہ کے زاویے سے شاید اس سے بڑی کتاب

اردو ادب میں موجود نہیں۔

مفتی کے ''علی پور کا ایلی'' والا دور وہ تھا جب ہم میں سے اکثر شاید پیدا بھی نہ ہوئے تھے یا بہت چھوٹے تھے یہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۵ء پر محیط ہے جب ہم میں سے اکثر لوگوں نے مفتی کو جانا تو ''الکھ نگری'' شروع ہو چکی تھی جو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے کینوس پر پھیلی ہے اور زندگی کا یہ سفر کسی منزل پر نہیں بلکہ ۱۹۹۵ء میں تلاش پر جا رُکا۔

عکسی نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ ''ممتاز مفتی کی تلاشِ ذات نے رُخ تبدیل کر لیا اور ارتقاء نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ نیا راستہ اپنا لیا۔ ممتاز مفتی کی زندگی ایک طویل تلاش ہے اور ان کی آخری تحریر کا نام بھی تلاش ہے۔

ممتاز مفتی خود اپنی کتاب ''تلاش'' کے بارے میں کہتے ہیں:

''اس کتاب کا نام غلط ہے قاری کہے گا اگر تلاش ہے تو منزل بھی ہو گی لیکن یہ ایسی تلاش ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ یہ بھی واضح نہیں کہ کس چیز کی تلاش ہے۔ کبھی شک پڑتا ہے کہ مسلمان کی تلاش ہے کبھی یہ کہ دور حاضرہ کی حقیقت کی تلاش ہے کبھی ایسے لگتا ہے کہ یہ تو سچ کی تلاش ہے، چھوٹی چھوٹی سچائیوں کی تلاش۔''

اور یہ سچ ہے کہ کتاب ''تلاش'' چھوٹی چھوٹی سچائیوں کے لطف و لذت سے بھری پڑی ہے اور جنہوں نے نہیں پڑھی وہ اسے ضرور پڑھیں کیونکہ یوں تو مفتی جی نے ہمیں بہت کچھ دیا لیکن یہ وہ تحفہ ہے جو کہ وہ جاتے جاتے دے کر گئے ہیں۔

-☆-

ڈاکٹر انور زاہدی

مفتی جی کی باتیں

مفتی صاحب سے میری آخری ملاقات اُن کے انتقال سے شاید کچھ دن پہلے ہوئی تھی جب میں اپنی بیوی کے ہمراہ مفتی صاحب کی عیادت کیلئے ان کے ہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں۔ انتہائی خاموشی سے ہم دونوں اُلٹے قدموں واپس ہونے لگے لیکن لگتا تھا مفتی صاحب نے اپنی بیگم کی بات سن لی تھی، انہوں نے کروٹ لی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

"آیار ڈاکٹر کیسا ہے تو؟"

مفتی صاحب کا یہ مخصوص اندازِ گفتگو اُن لوگوں کیلئے تھا جن سے وہ بے تکلفی سے ملتے تھے۔ خفت کے بوجھ تلے کہ میں چند روز قبل مفتی صاحب کے ساتھ منائی جانے والی شام میں شریک نہ ہو سکا تھا۔۔ آگے بڑھا اور اُن کی خیریت دریافت کی۔ مفتی صاحب کا چہرہ قدرے متورم تھا اور آواز میں بھی خفیف سی لرزش تھی۔ ۔ ۔ بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ مفتی صاحب چند روز بعد نہ ہونگے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنے بارے میں کچھ نہ کہتے ہوئے الٹا مجھ سے سوال کر دیا:

"تو اُس دن کیوں نہیں آیا تھا؟"

"بس مفتی صاحب مجھے سرگودھا جانا پڑ گیا تھا۔" اور وہ حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگے،

"خیریت رہی، سرگودھا کیسے؟"

یہ تھی مفتی صاحب کی ذہنی صحت کی حالت کہ وہ اس وقت بہت سی تکالیف کے باوجود

ذہنی طور پر محض الرٹ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ہاں مروت، محبت اور ایک مخصوص قسم کی وضع داری تھی جس کی وہ مرتے دم تک پاس داری کرتے رہے۔

ممتاز مفتی سے میری پہلی شعوری ملاقات ملتان میں ہوئی تھی، شعوری اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اس سے پہلے بھی میں اپنے بچپنے میں کئی بار ان سے مل چکا تھا۔۔۔ لیکن یہ کوئی ملنا نہ تھا، محض دیکھنے کی حد تک بات تھی۔ یہ ملاقاتیں ممتاز مفتی کے بہنوئی مظفر مفتی کے ہاں جن سے ہمارے خاندانی مراسم تھے، کبھی کبھار ہو جایا کرتیں لیکن جیسے بزرگ اپنی باتوں میں مگن رہتے ہیں بالکل ویسے ہی میں اور مفتی صاحب کا بھانجا اقبال جوان دنوں اسد ہوا کرتا تھا۔۔ اپنے کھیل کود اور کہانیوں کی کتابوں میں کھوئے رہتے۔ ویسے بھی مفتی صاحب کی شخصیت ایسی جاذب نظر نہ تھی کہ بطور خاص کسی بچے کو خواہ مخواہ ان سے ملنے یا ان کے پاس بیٹھنے کی خواہش ہوتی۔

پہلی اور باقاعدہ شعوری ملاقات اس وقت ہوئی جب مفتی صاحب قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ان کے ساتھ منائی جانے والی ایک شام کے سلسلے میں مسلم ہائی سکول کے سبزہ زار میں ابن انشاء کے ہمراہ موجود تھے۔ یہ شاید ۱۹۶۷ء کی بات ہو گی، تقریب قدرت اللہ شہاب کی کتاب ''یا خدا'' کے ضمن میں منعقد ہو رہی تھی۔ میں نے ابن انشاء سے ان کی چینی نظموں کے تراجم پر دستخط کرائے اور پھر قدرت اللہ شہاب سے ان کی کتاب ''یا خدا'' پر ان کے آٹو گراف لینے کیلئے مڑا تو ممتاز مفتی کو حیرت سے مسکراتے ہوئے اپنی جانب دیکھتے پایا۔ میں اس زمانے میں میڈیکل کالج کے دوسرے سال میں تھا۔ ہم لوگ تجسس اور تحیر کے مارے ہوئے تھے۔ بزرگوں کا احترام، انہیں سننا اور ان کے سامنے کم گوئی اس عہد کا شعار تھا۔ شاید یہی خوبی یا خامی مجھے آہستہ آہستہ ممتاز مفتی کے قریب لے گئی۔

بقول غالب۔۔۔ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'' مفتی صاحب بلاشبہ ایک بڑے ادیب تو تھے ہی لیکن اس سے کہیں بڑھ کر وہ ایک بڑے انسان تھے۔ بظاہر بے حد کھردرے، لیکن حقیقت میں انتہائی کھرے، مزاجاً فیاض، لینے کی بجائے کچھ دینے کے قائل۔ دوسروں کو نہ صرف بڑا سمجھنے بلکہ ان میں یہ احساس پیدا کرنے کے شوقین۔۔ خود کو

حقیر اور بے بساعت سمجھنے پہ قانع ہی نہیں دیکھنے دکھانے میں بھی انتہائی سادہ۔۔۔سادگی کی حد یہ کہ اگر کوئی انہیں نہ جانتا ہو تو کہیں سے ایک بڑے ادیب اور ایک ایسے ریٹائرڈ افسر کے بجائے جو اپنے وقت کے بڑے نامی گرامی ادیبوں اور حکام بالا کے قرب میں رہا ہو ایک معمولی سے انسان دکھائی دیں۔۔۔لیکن اس تمام قلندرانہ روش کے ساتھ ہی بہت خود دار اور اپنی وضع کے ایک بالکل نرالے انسان۔

اپنے بارے میں خود کہتے ہیں۔۔۔" ممتاز مفتی زندگی میں ربط سے محروم فرد ہے۔ میل ایڈ جسٹڈ، پیدائشی طور پر چھوٹا آدمی ہے۔ بڑے آدمی سے مل کر جھجک محسوس کرتا ہے، گھبراتا ہے، کتراتا ہے۔اسے کسی بنے سجے گھر میں لے جایئے چلا جائے گا لیکن دل دھک دھک کرے گا، سانس رکے گا، اندر ڈگ مگ ڈگ مگ ڈولے گا، یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔

اسے کسی اونچے عہدے پر بٹھا دو تو بیٹھ جائے گا لیکن یوں جیسے کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو۔افسروں کے ساتھ نہیں گھلے ملے گا، چھوٹے اسٹاف کے درمیان ایٹ ہوم محسوس کرے گا۔دفتر کے چپڑاسیوں کو سلام کرنا اس کی پرانی عادت ہے۔افسر کے ساتھ اس کا برتاؤ یا تو جی حضوریا ہوتا ہے اور یا کھچا کھچا، درمیانہ روی سے محروم ہے۔جی حضور یہ ہو تو سراسر جی جناب، جی صاحب، یس سر۔۔۔جسے اچھا سمجھ لے پھر اس کی ہر بات میں اچھائی نظر آتی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ جسے برا سمجھے اس میں بھی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔

مفتی صاحب کو پڑھتے پڑھتے بہت سا وقت گزر گیا اور میں ملتان سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔یہاں پہنچنے پر دوسری بہت سی باتوں کے ساتھ برادرم منشا یاد نے مجھے ادبی تنظیم "رابطہ" میں شامل کر لیا اور اس طرح ممتاز مفتی سے ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔ یہ شاید ۱۹۸۵ء کے جولائی یا اگست کی بات ہے جب رابطہ کے ماہانہ اجلاس کا قرعہ فال میرے نام نکل آیا۔اس تقریب میں جہاں رابطہ کے دوسرے تمام اراکین شامل تھے، وہیں قدرت اللہ شہاب بھی بطور مہمانِ خصوصی تشریف لائے تھے اور اس محفل میں انہوں نے "شہاب نامہ" جو ابھی شائع نہیں ہوا تھا کے ایک باب سے اقتباس پڑھ کر سنایا تھا۔یوں ہر

ماہ رابطہ کا اجلاس کسی ادیب کے گھر ہوتا اور مفتی صاحب سے ملنے کا بہانہ بن جاتا۔ اس زمانے میں ہسپتال میں میری ڈیوٹی شام کے وقت ہوتی تھی جس کی وجہ سے کئی بار رابطے کی محفلوں سے غیر حاضری ہو جاتی اور اگلے ہی دن مفتی صاحب کی فون کال نہ صرف سننی پڑتی بلکہ انہیں اس بات کا یقین دلانا پڑتا کہ آئندہ غیر حاضری نہ ہوگی۔ کئی بار میں نے انہیں اس بات پہ جھنجلاہٹ میں یہ کہتے ہوئے سنا،

''یار یہ وقار بن الٰہی بہت دنوں سے کچھ کیوں نہیں لکھ رہا؟''

جو ادیب، افسانہ نگار یا شاعر حضرات لکھتے رہتے وہ انہیں چھوڑ کر ہمیشہ اُن کی جانب دیکھتے جنہیں کچھ لکھے ہوئے یا رابطہ میں اپنی کوئی تحریر پیش کیے ہوئے عرصہ گزر گیا ہو۔

اب کہاں ایسے پراگندہ لوگ ۔۔۔ رابطہ جیسی فعال ادبی تنظیم جس کے کرتا دھرتا اگر منشا یاد تھے تو ممتاز مفتی اس کی روحِ رواں ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اس کیلیے ایک ماں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام آباد جیسے سرد اور خشک مزاج شہر میں اس ادبی تنظیم نے ملک بھر کے اور بیرون ملک سے آئے ہوئے ان گنت شاعروں، افسانہ نگاروں اور صاحب طرز ادیبوں کو اکھٹے مل بیٹھنے کے بے شمار مواقع فراہم کیے، اور آج گو کہ مفتی صاحب ہم میں نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رابطہ کے اب تک مستقل مزاجی سے چلنے کی ایک بڑی وجہ میں اسلام آباد کے کم وبیش سارے ادیبوں کی مفتی صاحب سے محبت شامل ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہسپتال میں شام کی ڈیوٹی کی وجہ سے میری صبحیں میرے اپنے تصرف میں تھیں اور اس وقت کو مجھے اکثر مفتی صاحب کی صحبت میں گزارنے کا موقعہ ملا۔ پہلی بار جب میں اپنی نظموں کا مجموعہ لے کر مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کتاب انہیں پیش کی تو وہ بیحد خوش ہوئے۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سید مقصود زاہدی کا بیٹا ہوں، تو کہنے لگے ۔۔ ''یار یہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

میں سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکا کہ ''مفتی صاحب میں آپ سے انور زاہدی کی حیثیت سے ملنا چاہتا تھا۔'' بہت خوش ہوئے، اٹھ کر اندر چلے گئے اور جب واپس آئے تو

اُن کے ہاتھوں میں ضخیم کتاب ''علی پور کا ایلی'' تھی جسے انہوں نے میرے نام لکھ کر مجھے عنایت کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ایورسٹ کی چوٹی سر کر لی ہو۔

مفتی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ادب پر باتیں، ادب کی تحریکوں پر باتیں، نفسیات اور ماورائے نفسیات، زندگی اور اس سے منسلک بے شمار قصے، مذہب اور تصوف، غرض کون سا موضوع تھا، جس پہ مفتی صاحب سے گفتگو نہ ہوئی ہو۔ ہر ملاقات کے دوران ایک سرشاری کی کیفیت رہتی اور ملاقات کے اختتام پر یہ احساس کہ تشنگی رہ گئی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں اُن سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ گذشتہ رات خراب گزری تھی اور اب سو رہے ہیں، لیکن کبھی کبیدۂ خاطر نہ ہوا۔ ہاں بس ان سے نہ ملنے کا ملال رہا۔ دن گزرتے گئے، کبھی رابطے میں تو کبھی ان کے گھر پر ملاقاتیں رہتیں۔ یوں بھی کئی بار ہوا کہ میں ان سے ملنے پہنچا تو کہنے لگے:

''یار ڈاکٹر آج یہ میرے مہمان آئے ہوئے ہیں، آئندہ سہی۔''

اور یوں بھی ہوا کہ مجھے زبردستی اندر لے جاتے، جہاں پہلے سے جناب اشفاق احمد اور ان کی بیگم بانو قدسیہ موجود ہوتیں اور میری معذرتوں اور بہانوں کے باوجود وہ مجھے سب کے ساتھ کھانے کی میز پر بٹھا لیتے۔ شیروں کی ہم راہی میں بیٹھ کر کھانے کی بھلا کس کی ہمت ہوسکتی ہے میری تعریف کرتے ہوئے مفتی صاحب نوالہ بنانا بھی دشوار کر دیتے۔

ایک دن مفتی صاحب کہنے لگے،

''یار ڈاکٹر، میں تجھ پر لکھنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی لکھنے والے کیلئے اس سے بڑا اعزاز اور بھلا کیا ہوسکتا ہے؟ میں نے کبھی بھی خود کو اس کا اہل نہیں سمجھا تھا، میں بظاہر خوشی اور احساسِ تشکر میں کھویا ہوا گھر واپس چلا آیا۔ جب غزالہ کو یہ بتایا تو وہ خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ آپ خوش قسمت ہیں، لیکن مجھے چُپ لگ گئی۔ اس کے بار بار پوچھنے پہ میں نے کہا مفتی صاحب نہ جانے مجھ پر کیا لکھ دیں گے۔ بس یہی سوچتے سوچتے کئی برس اور گزر گئے کہ میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''عذابِ شہر پناہ'' شائع ہوگیا۔ جب میں یہ لے کر مفتی صاحب کے ہاں پہنچا اور انہیں کتاب پیش کرتے

ہوئے یہ درخواست کی کہ اس مجموعے پر اپنی موقر رائے کا اظہار کریں تو مفتی صاحب نے کہا،

"تو ہی غافل رہا، میں تو بہت پہلے تجھ پر لکھنا چاہتا تھا۔"

اسی کتاب کی تقریب میں وہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے اور مجھ پر اپنا لکھا ہوا خاکہ "کامی" پڑھ کر سُنایا۔ تخلیق کار اپنی تخلیق کی تکمیل پہ کس سرشاری میں مبتلا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں، لیکن، جس وقت مفتی صاحب اپنا لکھا ہوا خاکہ پڑھ رہے تھے مَیں مسرت و انبساط کی جس کیفیت میں تھا اسے کبھی نہ بھلا پاؤں گا۔ ان کا تحریر کردہ یہ خاکہ ان کے خاکوں کے آخری مجموعے "اوکھے اولڑے" میں شامل ہے۔

میرے خیال میں مفتی صاحب کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو انہوں نے میرے نام لکھ کر نہ دی ہو۔ ایک مرتبہ اُن کی مشہور زمانہ کتاب "لبیک" جو دستیاب نہ تھی میں کہیں سے حاصل کر کے ان کے پاس لے گیا اور اُن سے اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی۔ انہیں یہ اچھا نہ لگا۔ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کتاب پہ لکھ دیا،

"یار اتنی بھی کیا جلدی تھی، تھوڑا انتظار کر لیتے۔"

اشفاق احمد نے ممتاز مفتی پر اپنے خاکے "سوا لاکھ کا ہاتھی" میں کہا ہے "ممتاز مفتی ایک ایسا ہمدرد، محبتی، انسان دوست اور خدائی خدمت گار قسم کا انسان ہے کہ بالاخر آدمی اس کی محبت سے تنگ آ کر بھاگ جاتا ہے۔"

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ میں نے تو جسے بھی دیکھا انہیں ممتاز مفتی کے عشق میں مبتلا دیکھا اور شاید اس عشق میں گرفتار ہو جانے کی بڑی وجہ مفتی صاحب کا وہ بے لوث رویہ تھا جس میں نہ کوئی غرض نظر آتی تھی نہ کوئی مطلب، نہ کسی قسم کا فریب۔ وہ تو ادب سے عشق رکھنے والوں کے عاشق تھے اور ہر نو آموز میں یہ اعتماد پیدا کرتے نظر آتے تھے کہ اگر وہ لکھتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب اس کی ایک اپنی دنیا ہو گی اور لوگ اس کی عزت کریں گے۔

خود مفتی صاحب نے خاکہ نگاری پر بات کرتے ہوئے اپنے خاکے میں کہا ہے "دو مقامات سے دیکھو گے تو ٹھیک نظر نہیں آئے گا، ۱) دور سے، ۲) بہت قریب سے۔"

میں خود کو نہ دور سے دیکھنے والے درجے میں شمار کرتا ہوں اور نہ ہی دوسرے میں، یوں سمجھ لیجئے کہ بس نزدیک سے دیکھنے کا موقع مل گیا اور مجھے یوں لگتا ہے کہ جو مفتی صاحب سے دور رہا وہ مختلف قسم کے تعصبات کا شکار رہا اور محض بیکار باتوں کی وجہ سے ان تک رسائی نہ کر پایا اور جسے ان کی قربت کا فیض مل گیا وہ ان کی محبت کا اسیر ہو کے رہ گیا۔

نظریاتی طور پہ میں اپنے آپ کو ممتاز مفتی سے مختلف سمجھتا ہوں لیکن ان کا آدرش بہت سے نظریاتی طور پر کمیٹڈ لوگوں سے کہیں بلند تھا۔ میری کہانیوں سے انہیں یہ شکایت رہی۔

''یار ڈاکٹر، تو اتنا اچھا لکھتا ہے، کبھی سیاست سے الگ ہٹ کر بھی لکھ۔''

میں مسکرا کر انہیں دیکھتا اور کہتا، ''مفتی صاحب کیا آپ کیلئے عورت سے بڑا کوئی اور موضوع ہے؟''

وہ یہ سُن کر ہنس پڑتے۔ اب جب کہ وہ نہیں ہیں تو میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ میری تازہ کہانیوں میں جو ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے، کہیں اس کے پیچھے مفتی صاحب کی آٹو سجیشن تو کارفرما نہیں۔ کتنے بڑے استاد تھے مفتی صاحب۔

-☆-

شہابہ گیلانی

ٹھنڈا میٹھا چشمہ

ولی تھے، مجذوب تھے یا محض اعلیٰ صفات کا حامل، ایک بہترین انسان، جو بھی تھے ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی ہجوم سے الگ، ایک منفرد، تنہا انسان جس کی ذات ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ تھی جیسے سمندر پیاسے کی ذات اور اس کا نام نہیں پوچھتا، انہوں نے بھی اپنے در پر آنے والوں کا حسب ونسب، عمل، عمر اور گروپ کچھ بھی نہ پوچھا۔ پوچھا بھی تو محض اتنا ''تیرا مسئلہ کی اے۔۔۔''

جھولیاں بھر بھر کر بھیجا۔ دعاؤں کی، مشوروں کی نایاب باتوں، ہومیو پیتھی پڑیوں کی سوغات سب کو بانٹی۔ اُن کی اپنی زندگی میں، ذات میں جوار بھاٹے تھے، بھنور تھے، ہزاروں تلاطم تھے، مگر وہ سب کچھ گہرائیوں میں چھپاتا دوسروں کے غم اپنے اندر انڈیلتا رہا اپنے شفاف پانیوں میں آنے والوں کی کثافتیں جذب کر کے نتھرے ہوئے ہلکے پھلکے بندے ری کنڈیشن کرتے رہے، شاید اس کا کردار ایک چھلنی کا تھا، تمام عمر ایک بشپ کی مانند وہ اپنے پرائیوں کے کنفیشنز اپنے چہرے پر سجاتے رہے۔ سب شانتی حاصل کرتے رہے اپنا بار اس کے کاندھوں پر منتقل کرتے رہے، جبکہ اس کا چہرہ دراڑوں سے اٹا رہا۔ کسی دوست کا، کسی سہیلی کا کوئی نہ کوئی المیہ ہر بار ایک نئی لکیر بن کر ان کے چہرے پر ثبت ہوتا رہا، وہ استقامت کا پیکر تھے۔ ادھر اُدھر کے زخموں کی ہتھوڑیاں سہتے حیرت کی بات ہے کہ ہر ضرب اس کے نقوش سنوارتی گئی اس کے نقوش مزید تیکھے ہوتے گئے، نکھرتے گئے، منحنی سا وجود ایک بہت بڑے مجسمے کی صورت میں ڈھلتا گیا' شاید اس لئے بھی کہ انسانوں سے زیادہ موتیوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہاں خدا شاید انہیں دلوں میں زندہ رکھنا چاہتا تھا مگر وہ

نہ نہ کرتا رہا۔ ہاتھ جوڑے عزت و تکریم سے بھاگتے رہے مگر ان کا قد بڑھتا ہی گیا وہ قد آور ہوتے گئے حتیٰ کہ وہ چھا گئے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ واقعی چلے گئے یا ابھی بھی ہمارے درمیان کہیں موجود ہیں۔ آخری دیدار کے وقت ان کے چہرے پر نظر پڑی تو یوں لگا کہ جیسے کوئی دھوپ کا جلا اچانک ہی کسی گھنے سائے کی پناہ میں آ جائے۔ میں منتظر رہی کہ وہ ابھی اپنی مسکراتی زندہ نگاہوں کا لشکارا مارتے اُٹھ بیٹھیں گے اور کہیں گے:

''لو تسی تے رون لگ پے جے کڑیو! میں مذاق کر رہیا ساں۔'' بانو آپا اپنے مخصوص رسان بھرے لہجے میں ہم جیسے بے حوصلہ لوگوں کو سمجھا رہی تھیں یہ جو چلے گئے یہ فوارے تھے ان کا منبع پراسرار تھا ہم تو پاس بیٹھنے سے ذرا سا بھیگ گئے ہیں۔

اس Trioka کے راز تو وہی جانیں مگر لبیک میں کالے کوٹھے والے کی جس ادا کے مفتی جی دیوانے تھے وہ تھی کالے کوٹھے والے کی ہجوم میں ہر شخص سے انفرادی محبت۔ انجانے میں انہوں نے خود بھی وہی چلن اپنا لیا ہم سب کو اپنا دیوانہ بنا لیا ہم سب بالشتیے ان کے پاس جا کر یکا یک باون گزے ہو جاتے تھے۔ مجروح انا کو وقار بخشا اور منبر پر بیٹھے فرعون کو معصومیت کے ساتھ پٹخنی دینا ان کا کام تھا۔ سبھی کی طرح مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے مجھے بے حد پیار دیا۔ دوست بھائی، بہن، ماں، بچوں کی طرح ہم لڑتے، بحث کرتے تو امی جی (مسز مفتی) ہنستے ہوئے کہتیں ''شہابہ! ایہناں دی تے اینویں عادت اے تنگ کرن دی تو نہ کھپیا کر'' کیسے بتاؤں کہ ان جیسے بے لوث انسان کے ساتھ کھپنا بھی ایک عبادت تھی اب عبادت کیونکر کروں؟ جانے ان کی زنبیل میں محبت کے دروازوں کی کتنی چابیاں پڑی رہتی تھیں کہ ہر دل کا دروازہ کھولنا انہیں آتا تھا۔

چمکیلی سردیوں کی ایک دوپہر یاد ہے جب ڈرائنگ روم کے روشن گوشے میں رلی پر بیٹھے ہم حسب معمول کھپ رہے تھے کہ پاکستان کے حوالے سے باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے ہر طرف پھیلی کرپشن کا رونا رویا تو بولے ''نہ تو کیوں پریشان ہوندی اے جس نے پاکستان بنایا اے اوہی ایدی حفاظت وی کرے گا۔'' میں نے کہا ''آپ کو اتنا یقین کیسے ہے۔'' تو جواباً ایک شعلہ سا لپکا تھا ان کی آنکھوں میں جس کی چمک آج بھی میرے اردگرد

پھیلی ہوئی ہے۔

شہاب کہندا اسی " Pakistan is created to be the seat of Imam Mehdi " ان کے لہجے میں اتنی مضبوطی تھی کہ میں کچھ بول نہ سکی۔ اسے معجزوں پر یقین تھا مجھے بھی ہے مگر کیا اب معجزے رونما ہوتے ہیں؟ اگر ہوتے ہیں تو خدا سے دعا ہے کہ ان جیسے کچھ اور لوگ زمین پر بھیج دے کہ کثافت سے دم گھٹنے لگے ہیں۔ لوگوں کی دور کی نظر کام نہیں کرتی سب اپنی ذات کے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ کوئی تو ہو کہ نظر سے چمڑے کے کھپے اتارے اور تازہ کھلی پاکیزہ فضاؤں میں سانس لینے اور جینے کا ڈھنگ سکھائے مگر مفتی جی جیسے لوگ تو صدیوں میں آتے ہیں حیران ہوں کہ اس سال بھی اس کی برسی آئی اور خاموشی سے چلی گئی ہم سب کی بے حسی پر ماتم کناں انفرادی یا اجتماعی سطح پر کچھ بھی تو نہ ہوا جو ہمیشہ فیض تھا میں اس کی روح سے نظریں چرا رہی ہوں وہ مجھ پر ہنس رہا ہے'' ایہہ سارے کھیڈ تماشے بس زندگی نال نیں'' لیکن اسے کیا فرق پڑتا ہے وہ تو آج بھی بلند اور ممتاز ہیں، کم ظرف تو ہم ہیں جو بیساکھیوں کے سہارے قد اونچا کرنے کے عادی ہیں ان جیسے Geniune اور بڑے انسان کو تو زمانہ ترسے گا اور ڈھونڈے گا۔

میں کبھی کبھی ان کے گھر والوں کے بارے میں سوچتی ہوں۔ عجیب الجھن کا شکار ہو جاتی ہوں یا اللہ یہ اتنے سارے دیوا ایک گھر میں سما کیسے گئے مفتی جی کے ساتھ ہجوم دیکھ کر وہ سب دھیرے دھیرے پس منظر میں چلے گئے کہ مفتی محض ایک خاوند باپ یا سسر نہ تھا وہ تو اب سب کی ملکیت بن چکا تھا بچوں نے، بیوی نے خندہ پیشانی کے ساتھ اسے سب کے ساتھ شیئر کرلیا وہ سب رسمی رشتوں کو بھول کر دوست بن گئے تو مفتی جی آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا رہا اور گرو (grow) کرتا رہا کہ پرشکوہ عمارتوں کی خوبصورتی اور مضبوطی اُن کی بنیادوں میں چپ چاپ پڑی اینٹوں کی مرہونِ منت بھی ہوتی ہے۔

-☆-

سید محمد علی

سوا لاکھ کا مفتی

''ادیب ہونا بالکل بیہودہ کام ہے، بیماری ہے، آپ ایک دفعہ اس میں پڑ جائیں تو نکل نہیں سکتے۔ بڑے بدنصیب لوگ ہیں، جو اس میں آتے ہیں۔ دراصل زود حسی بڑی ظالم شے ہے میاں بیوی میں ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو پاتی۔ اگر آپ زندگی میں خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میڈیم زندگی بسر کریں۔ شہرت ایک بلیڈ ہے جو خود کو بھی کاٹتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ میں ساری زندگی خود پر قارئین کو فوقیت دیتا رہا اب سمجھ میں آیا کہ قاری اور تماشبین ہونا بہترین حیثیت ہے، کاش میں بھی ادیب ہونے کی بجائے قاری ہوتا تو بہت سے دکھوں اور مسائل سے بچا رہتا۔''

یہ سب ممتاز مفتی نے حمیرا اطہر سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا۔ عبدالحمید اعظمی ممتاز مفتی کے بارے میں اپنے مضمون ''تلاش کا متلاشی'' میں تخلیقی کرب کے بارے میں لکھتے ہیں، ''لیپا ویلی کے اگلے مورچوں پر فوجی افسروں سے باتیں کرتے ہوئے ممتاز مفتی نے کہا تھا کہ ''نوجوان تخلیق کار ادب کے ہفت خواں کو باغِ جناح نہ سمجھ لیں۔ ادیب کو دوسروں کا دکھ اپنانا اور بیتنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایک من دکھ سمیٹیں گے تو تحریر میں صرف تولہ بھر سما سکے گا۔ یاد رکھیے دوسروں کا دکھ اور تخلیق ایک دکھ بھرا عمل ہے۔''

یہ سب تو تھا مگر ان باتوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ممتاز مفتی لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ وہ تو ایسے لوگوں کو بھی جن کا لکھنے سے دور کا واسطہ نہ ہو کہتا تھا کہ لکھا کرو، بس لکھو۔

میرے افسانہ نگار دوست حمید قیصر نے اپنی کہانیوں کی کتاب کا فلیپ ممتاز مفتی سے لکھوایا اور پھر میرے پیچھے پڑ گیا کہ تو بھی اپنے افسانوں کے بارے میں ممتاز مفتی کی رائے

لکھوالے بہت اچھا ہو جائے گا مگر میں اُن کے پاس جانے سے ڈرتا رہا۔ ایک ڈر یہ کہ اتنا بڑا ادیب، اگر اُس نے میرے لکھے کو رد کر دیا تو، دوسرا خوف یہ کہ میرے باس کا باپ ہے۔ حمید قیصر کا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر ایک دن میں ممتاز مفتی کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ڈرتے ڈرتے اپنے کچھ افسانے اُن کے سامنے رکھ دیئے۔

''جی میرا نام محمد علی ہے، حمید قیصر کا دوست ہوں، افسانہ لکھتا ہوں آپ کی رائے درکار ہے۔'' یہ سب میں نے رٹے رٹائے سبق کی طرح اُن کے سامنے دہرا دیا۔ انہوں نے افسانوں کی طرف دیکھا بھی نہیں، مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

''تجھے کہیں دیکھا ہے؟''

''جی ضرور دیکھا ہو گا''۔ میں صرف اتنا کہہ سکا اور باوجود کوشش کے انہیں یہ نہ بتا سکا کہ میں گذشتہ دس سالوں کے دوران بیسوں مرتبہ اُن کے گھر آ چکا ہوں۔ بیس برس تک اُن کے گھر سے محض ایک کلومیٹر کے فاصلے پر رہتا رہا ہوں۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر سینکڑوں مرتبہ سامنا ہو چکا ہے۔ تین مرتبہ اُن کے اس سوال کا سامنا کر چکا ہوں کہ ''تجھے کہیں دیکھا ہے۔'' آج چوتھی مرتبہ اسی سوال کا سامنا ہے اور میں اپنی فطری جھجک لئے افسانے سمیٹ کر بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ یہ جانے بغیر کہ وہ لمحے میرے لئے کتنے تاریخ ساز تھے اور میں کس کے حضور بیٹھا تھا۔

وہ کسی کاتب کی طرح زمین پر بیٹھے گتے میں کاغذوں کا دستہ لگائے کچھ لکھ رہے تھے۔ اچانک اُٹھے میرے کاغذات اُٹھا کر قریب رکھ لئے ''یہ میں پڑھوں گا'' یہ کہہ کر اندر چلے گئے۔ میں نے اُن کے جاتے ہی جھپٹ کر وہ اٹھا لئے، مجھے اُن کی واپسی سے زیادہ عکسی مفتی کے آ جانے کا ڈر تھا۔ میں واپس جانے اور نہ جانے کی کش مکش میں ہی تھا کہ وہ واپس آ گئے اور بیٹھتے ہوئے بولے، ''تو لکھنا جاری رکھ، لکھوانے کی فکر چھوڑ، افسانے چھوڑ جا میرے پاس۔'' انہوں نے گویا حتمی بات کی۔

''جی اچھا'' میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور اپنے افسانوں سمیت چلا آیا۔ پتہ نہیں اچھا کیا یا برا؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ اُس ملاقات نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ ظاہر دیکھنے

والوں کو وہ متاثر کر بھی نہیں سکتے تھے۔ پریشان بال، باچھوں سے بہتی پان کی پیک، استری سے بے نیاز کپڑے، لٹکتا ازار بند اور بات کرنے کا بے لحاظ انداز۔ اُس وقت پڑھا تھا نہیں اُن کو، بس سنا ہی سنا اور دیکھا ہی دیکھا تھا۔ اُن دنوں بابوں اور روحانیت کی میرے نزدیک ایک قہقہے سے زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اُن کی شہرہ آفاق کتابوں ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری'' کے بارے میں میری رائے تھی کہ کسی کا سر پھاڑنے کیلئے یہ کتابیں بہترین ہیں۔

ایک زمانہ وہ بھی آیا جب ممتاز مفتی نے لوک ورثہ کے ادارے میں بہت آنا جانا شروع کر دیا۔ یوں انہیں اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ وہی دن تھے جب ایک طویل عرصے بعد اُن کا ویسپا سکوٹر اسلام آباد کی سڑکوں پر فراٹے بھرتا اور اُس پر ایک رنگین آنچل کسی جھنڈے کی طرح لہراتا تھا۔ اس بات کا اندازہ تو اُن کی وفات کے بہت بعد میں اُن کی ذاتی ڈائریاں پڑھ کر ہوا کہ وہ اُن دنوں اپنی زندگی کے آخری عشق میں مبتلا تھے۔

ممتاز مفتی کے عشق کے حوالے سے پروفیسر احسان اکبر نے بڑی خوبصورت بات لکھی ہے کہ ''انہیں ہر عورت سے ہر لحاظ کے بغیر عشق ہے۔ عورت کے تصور تک سے انہیں محبت ہے۔ مگر دراصل محبت کرنے کے عمل سے محبت ہے شاید محبوبہ سے نہیں۔''

پھر پتہ نہیں دل برداشتہ ہو کر یا اُس کے کسی عمل سے خوش ہو کر انہوں نے اپنا وہ سکوٹر میرے دفتر کے کارپینٹر کو بخش دیا۔ سکوٹر پا کر اُس غریب نے اپنی اچھی بھلی سائیکل بیچ ڈالی، پتہ نہیں کس طرح چلانا سیکھا پھر فخر سے اُس پر دفتر آنے جانے لگا۔ یہ غریب کی زندگی میں چند روزہ بہار تھی کچھ ہی دنوں میں وہ سکوٹر سمیت پولیس کی نظروں میں آ گیا۔ نہ کاغذات نہ لائیسنس، سکوٹر تھانے میں بند کر دیا گیا۔ بیچارا کارپینٹر دفتر میں فرداً فرداً سب کی منت کرتا پھرے کہ کوئی سکوٹر رہا کروا دے۔ میرے پاس بھی آیا۔ میں نے بھی اُسے منہ بھر کے تسلیاں دیں۔ ایک مشورہ بھی دیا کہ تھانے جا کر پولیس والوں کو بتا کہ یہ سکوٹر کسی عام آدمی کا نہیں ممتاز مفتی کا ہے، اگر اُن میں رتی برابر بھی ادب نوازی ہوئی تو سکوٹر ضرور واپس کر دیں گے۔ سکوٹر واپس مل گیا، پتہ نہیں کیسے۔ جو اُس نے سنبھال کر گھر میں رکھ لیا، سائیکل پھر لے لی اور خوش ہے۔

ممتاز مفتی کی وفات کے کم وبیش بارہ دنوں بعد عکسی مفتی صاحب نے کسی کام کے سلسلے میں میرے ہاتھ میں وہ فائل دی جس میں وہ تعزیتی خطوط لگے ہوئے تھے جو ان کے والد کی وفات پر انہیں ملے تھے۔ اُس فائل میں لگے خطوط پڑھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا کہ مرنے والا بھی کیا شخص تھا، اور یہ کون لوگ ہیں جو اُس نوے سالہ بوڑھے کو اتنا رو رہے ہیں۔ آجکل تو ساٹھ سال سے زیادہ جینے والوں سے لوگ اُن کی زندگی میں ہی قطع تعلق کر لیتے ہیں مگر یہ کیسا شخص تھا جو تمام عمر لوگوں کو ہانکتا رہا مگر لوگ قوام پر سے اڑائی جانے والی مکھیوں کی طرح پھر اُس کے گرد ہو جاتے۔

میں اُس کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو میری حیرت دوچند ہو جاتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے پاس نہ عہدہ، نہ دولت، نہ وہ کسی کو خاطر میں لاتا ہے، اُس نے شہرت حاصل کی تو کیسے؟ وہ پی آر کا آدمی بھی نہیں تھا مگر پیار کا آدمی تھا۔ اُس کے چاہنے والوں کا وسیع حلقہ اُس کی پی آر کا نتیجہ نہیں اُس کے پیار کا ثمر تھا۔

عکسی مفتی کا کہنا ہے: ''روایت سے بغاوت ممتاز مفتی کا خاصہ تھی، بلکہ یہ اُن کے خمیر میں رکھ دی گئی تھی اور پہلی بغاوت انہوں نے اپنے باپ کے خلاف کی۔ مگر یہ تو مجھے اُن کی موت کے بعد علم ہوا کہ میرے باپ سے زیادہ روایتی آدمی کوئی تھا ہی نہیں۔''

وہ ٹھیک کہتے ہیں روایات کی پاسداری ممتاز مفتی کو وراثت میں ملی، باغی تو اُن کے اندر بیٹھا ادیب تھا جو اُن سے شعبدے بازیاں کرواتا رہا۔

مفتی محمد حسین، ممتاز مفتی کے والد تھے۔ اُن کے Testimonials میں ایک جگہ لدھیانہ کے ڈپٹی کمشنر لکھتے ہیں:

> Mufti Mohammad Hosain belongs to the family of the Batala who are known for their litrary attainments, good social standing and influence. I know his grand father Mufti Meran Bux as Professor of Persian and Arabic

in Amritsar M.B.College. He was universally respected for his piety and learning and as one who perhaps all his life had never injured a soul. Mufti Mohammad Hosain personally is a very keen young man and a successful District Inspector of Schools, and with all that popular With his subordinates and people. I am confident that he will make very good Extra Assistant Commissioner if he gets that post.

Sd/ Asghar Ali 1st September 1914

Deputy Commissioner, Ludhiana.

گویا مفتی خاندان میں دور تک علم و ادب کا راج تھا، روایت کی پاسداری تھی۔ ممتاز مفتی نے یہاں بھی بغاوت کی۔ کتابی، نصابی علم کو گھر کی باندی سمجھا، پرواہ نہ کی اور خود پر علم و آگاہی کے دروازے ذاتی مشاہدے، آوارگی اور عورت کے مطالعے سے کھولے۔

اپنے مضمون ''عورت اور جنسیات'' میں لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں پرانے زمانے میں جب بے حجابی کا دور دورہ تھا، مرد عورت کی بے باکی سے اکتا گیا۔ اس کے جنسی جذبات آزاد جنسی ماحول اور روزمرّہ اشتعال کی وجہ سے اس قدر ٹھنڈے پڑ گئے کہ کسی بے حیا عورت نے ضرورت وقتی کے ماتحت اسے از سرِ نو اکسانے کیلئے حیا ایجاد کرلی، جس طرح برہنگی کے زمانے میں کسی چالاک اور بے حیا نے کپڑے ایجاد کئے تھے۔''

عورت کے جس دکھ، کرب اوران کہی کوانہوں نے محسوس کیا اور لکھا، اُس کے اظہار کا شعور خود عورت نہیں رکھتی، عورت کے بارے میں اُن کے لکھے کو پڑھ کر خود عورت دانتوں میں انگلی دبا کر سوچتی ضرور ہوگی کہ کہیں پچھلے جنم میں وہ۔۔۔

پھر جب ممتاز مفتی نے رختِ سفر باندھا اور ہم اُن کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے پہنچے تو مردوں سے زیادہ بین کرتی عورتوں کا ہجوم دیکھ کر بڑا رشک آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ میری اور ممتاز مفتی کی شناسائی کا عمل اُن کی موت کے بعد شروع ہوا۔ ایسے کیمیائی عمل کی طرح جو بڑا سست رفتار مگر بہت زود اثر ہو۔ ممتاز مفتی ٹرسٹ قائم ہو گیا۔ اب ممتاز مفتی کے نام جو خط آتا عکسی مفتی صاحب میرے حوالے کر دیتے، کہتے جواب ضرور جانا چاہیے، اور میں حیرت اور آزمائش کے ایک نئے مرحلے سے دوچار ہو جاتا کہ ایسے خط کا کیا جواب دوں جس میں لکھنے والے نے اپنے آپ کو مکمل طور پر مُرشد کے حوالے کرتے ہوئے صاف لکھ دیا ہے کہ ''بس اب آپ ہی ہیں جو میری کشتی پار لگائیں گے۔''

ممتاز مفتی کو پڑھنا شروع کر دیا، اونو! کیا رائٹر تھا۔ قلب و جاں کو ساتھ لے کر چلنے والا۔ پتہ یہ چلا کہ عورتیں یوں ہی مفتی مفتی نہیں کرتی تھیں۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں عورت ہی کو تو لکھا ہے۔ عورت کے جذبات و احساسات کے وہ پہلو کھول کر رکھ دیئے ہیں جنہیں آج تک خود عورت نہیں بیان کر سکی۔ عورت کے دکھ، عورت کا سیاپا، عورت کی محبت اور عورت کی نفرت، ان سب کا بیان ممتاز مفتی کا خاصہ تھا جس نے اُنہیں افسانہ نگاروں میں ممتاز بنا دیا۔ آپ ''کہی نہ جائے'' اور ''ان کہی'' پڑھیں تو سہی۔

ممتاز مفتی کا سٹائل انوکھا نہیں، نہ وہ کوئی انوکھی بات کرتے ہیں۔ وہ تو بڑی سادگی، بڑی صاف دلی سے وہ لکھ دیتے ہیں جو نظر نہیں آتا، جو کہا نہیں جا سکتا۔ ایسے بیان کی قدرت ممتاز مفتی ہی رکھتا تھا۔

ایک روز سُنا کہ ممتاز مفتی فرائیڈ کے متوالے تھے۔ پھر کیا تھا فرائیڈ کو پڑھا اور اُن کے افسانوں میں اُس کی تلاش شروع کر دی۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ بابا جی نے فرائیڈ کو بھی شریعت

کے دائرے میں لا کھڑا کیا تھا:

"جب وہ کسی محلے دار میار کو کوئی مسئلہ سمجھا رہے ہوں اور دفعتاً وہ جھینپ کر آنکھیں جھکا لے جیسا کہ میاروں کی عادت ہے تو شاید آپ کو شبہ ہو کہ مولوی صاحب کی آنکھ سے کوئی چنگاری اُڑی ہے یا جب وہ کسی نوجوان لڑکی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر رہے ہوں تو اس کانپتے ہوئے خمدار ہاتھ کو دیکھ کر یہ گماں ہو کہ یہودی ہاتھ سونے کی ڈلی سے کھیل رہا ہے یا شاید ہاتھ میں کمان سا جھکاؤ دیکھ کر تعجب ہو کہ آخر ہموار جگہ پر پھیرنے کیلئے ہاتھ میں خم کی کیا ضرورت ہے۔"

(مورا)

"اب بھی وہ شام کو رحمت کو بلاتی ہے۔

"رحمت!"

اور وہ بیگم کو خوش کرنے کیلئے راستہ ٹٹولتا ہوا آتا ہے۔ "جی!"

"اپنا ہاتھ دے مجھے۔"

پھر اس کا بڑا سا گرم گرم ہاتھ، ہاتھ میں لے کر اسے اپنی چارپائی ٹٹولنے میں مدد دیتی ہے۔ "رحمت! یہ میری چارپائی ہے۔ دیکھ لو، خبردار جواب کے بھول کی تم نے۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔اپنا دوسرا ہاتھ دو نا۔۔۔ہاں۔۔۔اور۔۔۔اور یہ میں ہوں۔۔۔میں ۔۔۔یہ۔۔۔اچھی طرح دیکھ لو۔۔۔اندھے! سمجھ لو۔"

(اندھا)

ایک روز شام ڈھلے پریشانی اور غصّے کی ملی جلی کیفیت لیے حسبِ عادت ریلکس ہونے قبرستان چلا گیا۔ اسلام آباد کے اس شہرِ خموشاں کے پاتھ ویز پر چلتے ہوئے بہار کی شاموں کا رنگ ہی اور ہوتا ہے۔ بلا کسی ارادے کے ممتاز مفتی کے مرقد پر جا کھڑا ہوا۔ بڑی سی سنگِ مرمر کی سفید سل پر لکھا "ممتاز مفتی" دور ہی سے نمایاں ہے۔ سرہانے ایک صندوقچی پڑی

رہتی ہے۔ کھول کر دیکھا تو قرآن پاک کے اوراق کے ساتھ ممتاز مفتی کے نام دو خطوط بھی پڑے تھے۔ دل چاہا اٹھا لاؤں، مگر اپنے آپ [illegible] کچھ دیر لڑنے کے بعد وہ ویسے ہی چھوڑ دیئے۔

ملا اس کی

اُسی بہار کی ایک شام کا ذکر ہے پھر وہاں گیا۔ صندوقچی کھولی، خط نہیں تھے۔ باخدا ہم نے نہیں اٹھائے۔

(یہ مضمون مارچ ۲۰۰۲ء میں لکھا گیا تھا)

-☆-

ڈاکٹر امجد ثاقب

سکّہ

ہشیار و ا

مہا اوکھا مفتی

اُردو کے عظیم شاعر میر تقی میر کے بارے میں کسی نقاد نے کہا تھا کہ میر جیسی شاعری کے لیے میر جیسی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ یہ بات ایک اضافے کے ساتھ ممتاز مفتی پہ بھی صادق آتی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ممتاز مفتی جیسا ادب تخلیق کرنے کے لیے ممتاز مفتی جیسی زندگی گزارنا پڑے گی۔ تلخ، شیریں اور متذبذب۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی تحریروں کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے وہی سرمستی درکار ہے جس نے اُردو کے اس ادیب کو تمام عمر اپنی گرفت میں لئے رکھا۔ حیرت، جستجو، تجسس، بغاوت۔ اگر آپ محبت سے ناآشنا ہیں، علم سے علاقہ نہیں رکھتے، نفسیات سے بے گانہ ہیں، انسان کے اندر جھانکنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، تخیل کی طاقت اور جذبے کی جادوگری کا شکار نہیں ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے کبھی بغاوت کا زہر نہیں پیا تو آپ ممتاز مفتی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ زندگی قوس قزح کی طرح ہفت رنگ ہے۔ جس طرح زندگی کو سمجھنے کے لیے کوئی ایک بات، کوئی ایک مضمون یا کوئی ایک کتاب کافی نہیں اسی طرح ممتاز مفتی کے بارے میں بھی کوئی ایک مضمون لکھنا مشکل ہے ہفت رنگ، ہمہ جہت اور بوقلموں۔ ممتاز مفتی اصل میں زندگی ہی کا ایک اور نام ہے۔

ممتاز مفتی سے میرا تعارف آج سے پچاس برس پہلے اس وقت ہوا جب میں میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا۔ سیکنڈ پروفیشنل کے امتحان میں تین روز باقی تھے کہ اچانک مجھے کہیں سے علی پور کا ایلی مل گئی۔ اُردو ادب کا جھومر، اس عہد کی محبوب کتاب اور پھر وہی ہوا جو اس کتاب کو پانے کے بعد ہو سکتا تھا۔ تین دن تین راتیں اس بحرِ ذخار میں گزر گئیں جسے اُردو

ادب کا گرنتھ صاحب کہا جاتا ہے۔ ایک ایک حرف، ایک ایک سطر۔ ایک ایک بار نہیں کئی کئی بار پڑھی اور یوں پہلی بار کسی امتحان میں ناکام ہونا پڑا۔ مجھے اس ناکامی پر کوئی ندامت نہ تھی کہ ایلی کی معیت میں جو درد اور گداز ملا اس کی بدولت زندگی کے اَن گنت امتحان آسان ہوتے گئے۔ اس ناکامی پہ اس روز بھی افسوس نہ ہوا اور آج پچیس برس گزرنے کے بعد بھی ملال کا شائبہ نہیں کہ علی پور کا ایلی ایک کتاب نہیں ایک خزینہ ہے۔ اگر آج بھی تین روز کے بعد کوئی امتحان ہوا اور یہ کتاب پہلی بار پڑھنے کو ملے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا۔ زندگی اگر سیکھنے اور دیکھنے کا ایک عمل ہے تو علی پور کا ایلی اس عمل کا بہترین ذریعہ۔ پچیس سال پرانے تعارف کے باوجود مجھے ممتاز مفتی سے ملنے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ نہ ان سے مصافحہ کیا، نہ گلے ملے، نہ پاس بیٹھے۔ آپ میری اس محرومی کو رحم یا استہزاء کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا شخص ہے جو ممتاز مفتی کے عہد میں زندہ تھا لیکن اس کو دیکھنے سے محروم رہا۔ تاہم تعلق محض ہاتھ ملانے یا قدموں میں بیٹھنے کا نام نہیں۔ جن سے محبت ہو جائے ان سے ملنا کیا بہت ضروری ہے۔ اس بھید پر دانشوروں کے دانشور جناب اشفاق احمد بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ اپنی بے پناہ عقیدت کے باوجود میں ان کے در نیاز پہ بھی صرف ایک بار جا سکا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ ممتاز مفتی کے نظریہ فن اور ان کے ادبی مقام کے بارے میں تو وہی لوگ بات کر سکتے ہیں جو خود امام سخن ہوں یا جنہوں نے ممتاز مفتی جیسی زندگی گزاری ہو۔ بھرپور، بانکی، بجیلی، کٹھن۔ ہم جیسے ناتوانوں کے لیے یہ بھاری پتھر اُٹھانا ممکن نہیں۔ جب مجھے اس کتاب کے بارے میں گفتگو کے لیے کہا گیا تو کچھ اطمینان ہوا کہ گو اس پردہ زنگاری میں محبوب تو وہی ہے لیکن ہمیں جو کہنا پڑے گا وہ دوسروں کی تحریر کے حوالے سے ہوگا۔ ''مہا اوکھا مفتی'' ممتاز مفتی کے فن اور شخصیت کے بارے میں لکھی گئی چند خوبصورت تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب سے جہاں ممتاز مفتی اور ان کے فن کو بہتر انداز میں دیکھنے میں مدد ملتی ہے وہیں ان کی ذات کے کچھ نئے گوشے بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔ عقیدت میں بھیگی ہوئی یہ تحریریں ممتاز مفتی کو پڑھنے والوں کے لیے ایک تحفے سے کم نہیں۔ لکھنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں ممتاز مفتی کا قرب حاصل تھا اور وہ لوگ

بھی ہیں جو صرف ان کی تحریروں سے فیض یاب ہوئے۔ میری طرح کم نصیب جو محبوب تک پہنچنے کے لیے دستک دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ کتاب کے پہلے حصے میں سب سے اہم مضمون بار برا میٹکاف کا ہے۔ جس نے ممتاز مفتی کی شخصیت اور روحانی تجربوں کو سہہ جہتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یا تناظر برصغیر کی مخصوص صوفیانہ روایت، اسلام کی راسخ العقیدگی اور مغرب کی گہری بے یقینی سے وجود میں آیا۔ بار برا میٹکاف نے اپنے مضمون میں جو نتائج اخذ کیے اور مفتی کے مذہبی عقائد کو جس طرح گمان اور یقین کی کشمکش کا شکار سمجھا اس سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس کے اس دعوئ سے اختلاف شائد ممکن نہ ہو کہ ممتاز مفتی نے یہ داستان لکھ کر ثابت کیا کہ خدا کا گھر ان لوگوں کا بھی ہے جن کا ایمان ناقص اور وقتی ہوسکتا ہے۔ مسعود قریشی، نذیر احمد، حمید اعظمی، احسان اکبر، اکرام بریلوی اور اسد فیض نے کتاب کے اس حصہ میں ان مختلف اصناف فن کا تذکرہ کیا جن سے ممتاز مفتی نے اپنا ہنر آزمایا۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، سفر نامہ، رپورتاژ، خاکے، سوانح عمری۔ اور وہ کچھ بھی جس کا ادبی لغت میں کوئی نام ہی نہیں۔ ممتاز مفتی کے فن اور ہنر کے بارے میں یہ باتیں یقینی طور پر سنگِ میل ثابت ہوں گی۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں ممتاز مفتی کے فن کی جگہ ان کی شخصیت پر اظہار خیال ہوا لیکن جس طرح فن اور فنکار کو الگ کرنا ممکن نہیں اس طرح ان مضامین میں بھی فن اور شخصیت کی تقسیم بے معنی نظر آتی ہے۔ ممتاز مفتی پر کی گئی ہر بات اس کے فن پر تبصرہ ہے اور اس کے فن پر کی گئی ہر بات اس کی شخصیت کے اسرار کی گرہ کھولتی ہے۔ اس حصہ میں سب ہی مضمون خون دل میں ڈوب کر لکھے گئے ہیں لیکن جاوید چوہدری، صغیرہ بانو شیریں اور عقیل روبی کے مضامین گہری عقیدت اور دلی جذبات کا اظہار ہیں۔ ان مضامین میں کسی نے کہا کہ اس نے محبت کرنا ممتاز مفتی سے سیکھا ہے۔ کسی نے کہا کہ ممتاز مفتی نے مجھ میں اپنے اندر جھانکنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ کسی نے کہا کہ مفتی صاحب نے اُردو ادب کو اسلوب اور بلاغ کا نیا پیراہن دیا۔ کسی نے کہا کہ میرے ہاتھ میں قلم ممتاز مفتی نے تھمایا۔ میں سمجھتا تھا کہ لکھنے کے لیے بہت بھاری بھر کم لفظ درکار ہیں لیکن ممتاز مفتی کو پڑھا تو علم ہوا کہ لفظ

نہیں لکھنے کے لیے تو صرف جذبے کی ضرورت ہے۔ ممتاز مفتی نے دکھ کو زبان دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ علم پڑھنے سے کم مشاہدے سے زیادہ آتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ممتاز مفتی کا مخاطب خواص نہیں عوام ہیں۔ آصفی محلے کے رہنے والے وہ لوگ دُکھ، محرومی اور آرزو کے کرب کا شکار رہتے ہیں۔ جو بغاوت اور روایت کی کشمکش میں گم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے غربت کو موضوع نہیں بنایا لیکن اس نے جو بھی لکھا غریبوں کے بارے میں لکھا۔ پُر پیچ گلیاں، مدقوق چہرے۔ تھوک اُگلتے ہوئے مرد و زن! نچلے متوسط طبقہ کے وہ بدقسمت لوگ جو ہر آنے والے دن کے ساتھ غربت کی گہرائی میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ممتاز مفتی بیسویں صدی کے پاکستانی تمدن کا مظہر ہے۔ اتنا بڑا فنکار کہ لوگ اس پر اور اس کے فن پر ہمیشہ اظہار خیال کرتے رہیں گے۔ اس کی تحریروں کو ہر آنے والے عہد کے منظر نامے میں پرکھا جائے گا۔ زندگی کی اقدار یا تنقید کے اصول خواہ کوئی رنگ اختیار کریں ممتاز مفتی ہر امتحان سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ اس لیے کہ وہ صرف اس عہد کا ادیب نہیں آنے والے زمانوں کا ادیب بھی ہے۔ اس کی تلاش میں ماضی سے زیادہ مستقبل پنہاں ہے۔ اس کتاب کا ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ ممتاز مفتی کی شخصیت پر لکھے جانے والے چودہ مضامین میں سے سات مضامین خواتین نے لکھے ہیں۔ سادہ، پرکار اور دلنشین۔ یہ امر اتفاق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کی محبوبیت شاید اُردو کے کسی اور ادیب کو حاصل ہوئی ہو۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے میرا کام
مجنوں کا برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے

جو شخص ایک صدی کا بوجھ اُٹھا کر بھی بوڑھا نہ ہوا اور اتنی ذہین اور باوقار خواتین کی توجہ کا مرکز بنا رہے وہ یقینی طور پہ ایک غیر معمولی انسان ہی ہو سکتا ہے۔ خواتین کے ان مضامین سے عقیدت کے علاوہ وارفتگی، محبت اور بے ساختہ پن جھلکتا ہے جو ممتاز مفتی کو ادا ہونے والا سب سے بڑا اخراج ہے۔ اس کتاب اور اس تقریب کے حوالے سے میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ ہم نے ممتاز مفتی پر ہر طرح سے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کیے لیکن ایک

اہم پہلو جس پر پیش رفت نہ ہو سکی وہ یہ ہے کہ برصغیر کے اس عظیم ادیب کو اُردو ادب کی چار دیواری سے نکال کر دنیا کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے۔ ممتاز مفتی اس لیے ممتاز مفتی بنا کہ اس نے عالمی ادب پڑھا۔ اب اسے عالمی ادب پڑھنے والوں تک لے جانے کے لیے ہمیں اس کی ہر تخلیق کو دنیا کی ہر اہم زبان کا پیراہن پہنانا پڑے گا۔ اگر ممتاز مفتی پاکستان کے نثری ادب کی شناخت ہے تو ہمیں اس شناخت کو لہروں کے حوالے کرنا ہو گا تاکہ ''دُکھ کے پانیوں میں گھرے'' اَن دیکھے اَن جانے جزیرے بھی اس کے سچ سے سیراب ہو سکیں۔

(یہ مضمون ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۲ء ممتاز مفتی کی برسی کے موقع پر ہوٹل آواری لاہور میں پڑھا گیا)

-☆-

حمیرا اطہر

میری ادب بیتی

نومبر ۱۹۸۷ء کے تیسرے ہفتے کی بات ہے اخبارِ خواتین میں جمیلہ ہاشمی کے انٹرویو سے متعلق ممتاز مفتی کا جوابی خط شائع ہوا تھا۔ میں اتفاق سے ان دنوں راولپنڈی میں تھی ایک روز شام کو شمیم اکرام شاہ فیصل مسجد دکھانے اسلام آباد لے گئیں تو واپسی پر مجھے یاد آیا کہ ممتاز مفتی بھی اسلام آباد میں رہتے ہیں میں نے شمیم سے پوچھا مفتی جی کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟ اور شمیم نے گاڑی ان کے گھر کی طرف موڑ دی چند منٹوں میں ہم مفتی جی کے گھر میں تھے۔

"مفتی جی آپ کا مجرم حاضر ہے یہ حمیرا ہیں انہوں نے ہی جمیلہ ہاشمی کا انٹرویو لکھا ہے۔" شمیم نے ان سے میرا تعارف کرایا تو مفتی جی مسکرائے۔

"اچھا تو آپ ہیں حمیرا اطہر خیر آپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے صحافیوں کا تو کام ہی ایسا ہوتا ہے" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "اب میں جمیلہ ہاشمی یا اس انٹرویو کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا اپنے مضمون میں لکھ دیا۔ اب کوئی اور بات کریں" (آج میں حیران ہوں کہ مفتی جی کو یہ کیسے پتہ چل گیا تھا کہ جس وقت میں ان کا انٹرویو شائع کروں گی جمیلہ ہاشمی اس دنیا میں نہیں ہو گی لہٰذا انہوں نے اس بارے میں کچھ بولنے سے پرہیز کیا)

"تازہ شمارے میں میرزا ادیب کا انٹرویو شائع ہوا ہے اور انہوں نے بھی آپ کے بارے میں ایک دو باتیں کی ہیں میں نے سوچا کہ آپ کو ایک اور مضمون لکھنا پڑے گا لہٰذا میں خود ہی پوچھ لوں"۔

میری بات پر مفتی جی بولے" میں میرزا ادیب کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اس کی دو کتابوں "صحرانورد کے خطوط" اور "صحرانورد کے رومان" نے تہلکہ مچایا مگر اس کے بعد کسی تحریر نے متاثر نہیں کیا۔ ویسے اس نے کیا کہا ہے؟۔

"آپ نے ایک بات کہی تھی کہ عکسی مفتی کے کہنے پر آپ نے دو سال تک لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میرزا ادیب نے کہا ہے۔"

"ممتاز مفتی بڑہانکتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ادب سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تخلیقی عمل سے باز نہیں آئے۔ لیکن انہیں سنسنی پیدا کرنے کی عادت ہے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تخلیقی عمل سے ہاتھ نہیں اٹھایا مگر افسانہ لکھنا چھوڑ دیا تھا"۔ ممتاز مفتی نے جواب دیا۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ مجھ سے عکسی نے کہا ابو آپ کہانیاں لکھنا بند کر دیں۔ آپ آج کے نہیں بلکہ اپنے زمانے کے نوجوانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سو میں نے افسانے لکھنے بند کر دیئے اور نوجوانوں کی محفل اختیار کر لی۔ آج کے نوجوانوں کو سمجھا تو خیال آیا کہ واقعی عکسی ٹھیک کہتا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

ممتاز مفتی اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ جنہوں نے جنسی نفسیات پر چند معرکتہ آلارا افسانے لکھے ہیں۔ "گڑیا گھر" اس کی مثال ہے۔ میں نے مفتی جی سے پوچھا کہ انہیں اس موضوع پر لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ جواب میں انہوں نے کہا۔

"میرا خیال نفسیات کی طرف تھا۔ جنس بعد میں آئی ہے۔ میں نفسیات کا طالبعلم تھا۔ جنسی نفسیات کے سلسلے میں مَیں سب سے زیادہ دوستوفکی سے متاثر ہوا۔ اس کی تحریروں میں جنسیات زیادہ تھی۔ میں تو اتفاق سے پھنس گیا۔"

آپ نے اردو افسانوں میں تجربات بھی کئے ہیں اس لئے آپ کا شمار جدید افسانے کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔ آج کل اردو افسانوں اور ناول میں جو تجربات کئے جا رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ خصوصاً انیس ناگی کی کتاب "دیوار کے پیچھے" انور سجاد کی "خوشیوں کا باغ"، فہیم اعظمی کی "جنم کنڈلی" بانو قدسیہ کی "راجہ گدھ"

اور مظہر الاسلام کی کتابیں ''گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی'' یا'' باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی'' وغیرہ وغیرہ۔

ممتاز مفتی نے کہا ''میری دانست میں ادب ایک دریا ہے یہ نہ جدید ہے نہ قدیم یہ کسی پہاڑی علاقے میں آتا ہے تو شور مچاتا ہے۔ میدانی علاقے میں جاتا ہے تو مدہم ہو جاتا ہے فی زمانہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے ان میں سے کچھ تحریریں قائم ہو جائیں گی اور کچھ مٹ جائیں گی میں ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا اتنا ضرور کہوں گا کہ آج کا لکھنے والا میری نسبت چار گنا زیادہ ذہین ہے اور چھ گنا زیادہ معلومات رکھتا ہے اس میں ضرورت سے زیادہ حرکت ہے قیام کی کمی ہے مگر ادب خالی حرکت سے نہیں بنتا اس سے نئی راہیں ضرور نکلتی ہیں مگر قیام کی ضرورت ہے۔ میں جدید ادب کا مداح ضرور ہوں مگر کئی ایک ایسے لکھنے والے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کی تحریروں میں کچھ ٹکڑے ہوتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ کچھ ٹکڑے ہوتے ہیں جو خوبصورت ہوتے ہیں۔ مگر پوری کہانی کوئی تاثر نہیں چھوڑتی اگرچہ ایک افسانے میں ایک تاثر نہیں ملتا مگر میں انہیں بیکار بھی نہیں کہہ سکتا۔''

لیکن آپ کے نزدیک جدید ناول کونسا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ممتاز مفتی نے بتایا'' میں بہت کم ناول اور کتابیں پڑھتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ بہت پڑھتا تھا پھر سوچا پڑھنا بیکار ہے۔ لکھنا بہت وقت مانگتا ہے۔ مجھے سوچنا پڑتا ہے۔ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جدید ناولوں میں ''راجہ گدھ'' پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کاش میں بھی ایسا ناول لکھ سکتا۔''

بہت سے نئے لکھنے والے عصری مسائل پر لکھنے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ممتاز مفتی کا کہنا ہے کہ میں نے اس مسئلے پر لکھا ہے نہ لوگوں سے توقع کی ہے۔ یہ جو لکھنے والے کی خوش فہمی ہے کہ مسائل پر لکھیں گے اور حل بتائیں گے مصلح بن جائیں گے۔ ایسا نہیں ہے مجھے تو کسی کی تحریر میں یہ بات نظر نہیں آئی۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ نے زندگی کا ایک خوبصورت ٹکڑا دیکھا اور پیش کر دیا۔ اب یہ پڑھنے والے کی مرضی ہے کہ وہ اس میں مسائل کا حل ڈھونڈے یا نہ ڈھونڈے''

اس رائے کے باوجود ممتاز مفتی موجودہ ادبی سرمائے سے مایوس نہیں ہیں۔ اس بارے میں اُن کا کہنا ہے اس وقت بڑا اچھا ادب پیدا ہو رہا ہے۔ آپ کا مکتبِ فکر اُسے سمجھے یا نہ سمجھے۔ ہمارے نئے ادیب بڑے ٹیلینٹڈ ہیں یہ تحریک کا روائتی دور ہے آگے جا کر ادب میں اس کا بہت بڑا حصہ ہو گا۔ ویسے میں شاعری کو دنیا کا سب سے بڑا آرٹ مانتا ہوں نثر اسکے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی مصوری کا نمبر بھی بعد میں آتا ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو میں نقطۂ نظر کو مانتا ہی نہیں کیا چکھ کر دیکھنے کا عمل ادب ہے؟ صورتِ حال یہ ہے کہ ایک شخص نے اردو میں ایم اے کیا چار سال بچوں کو پڑھایا ایک نوٹ بک بنائی۔ اس کی بنیاد پر چند لوگوں کے خلاف لکھا چند کی تعریفیں کیں اور شہرت مل گئی۔ نقاد کچھ اور نہیں کر سکتے۔ لکھ نہیں سکتے تو شہرت حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تنقید تخلیقی عمل نہیں ہے اور جو تخلیقی عمل نہیں ہے وہ ادب کا حصہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید ادب کی راہنمائی نہیں کرتی۔ انگریزی ادب میں تخلیق تنقید دیکھنے میں آتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں نہیں۔"

میں نے ممتاز مفتی سے پوچھا آپ کیوں لکھتے ہیں؟ کس کے لئے لکھتے ہیں؟ کہنے لگے میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ میرے قاری کون ہیں؟ میں صرف اپنے لئے لکھتا ہوں "لبیک" کے بعد مجھے دو ہزار خطوط آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے یہ پہلی کتاب لکھی ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ لکھا بیکار نکلا۔ اب لکھنا بیکار عمل ہے۔ نہ کوئی پڑھتا ہے اور نہ غور کرتا ہے۔ ان خطوط میں دس خطوط ملک کے بڑے علماء کے بھی تھے انھوں نے مجھے گالیاں دے کر لکھا تھا کہ تم بڑے خبیث شیطان ہو خدا کی شان میں گستاخی کرتے ہو۔ انہوں نے دوزخ کا نقشہ کھینچا تھا جہاں ان کے مطابق مجھے جانا ہے۔ مفتی جی نے اب تک صرف ایک ناول لکھا ہے "علی پور کا ایلی" وہ بھی آپ بیتی ہے۔ میں نے ان سے ناول نگاری کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ پوچھی تو بولے "ناول لکھنے کے لئے میرا جی بھی بہت چاہتا تھا مگر مجھے علی پور کا ایلی کھا گیا اس کی کہانی ۱۹۴۷ء پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد میرا ارادہ تھا کہ ۱۹۴۸ء سے لے کر اپنی موت تک کے عرصے پر دوسرا ناول لکھوں گا۔ اس کی سولہ سترہ

قسطیں بھی لکھ لیں۔ ان میں سے کچھ شائع ہوئیں تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ تُو تو ننگا ہو کر ناچتا ہے۔ ہمیں کیوں ننگا کرتا ہے؟ چنانچہ اب میں نے اسے مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ مجھے ادب سے زیادہ اپنے تعلقات عزیز ہیں۔

ممتاز مفتی کا کہنا ہے ''مجھے علی پور کا ایلی'' لکھنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اردو میں جتنے بھی ناول لکھے جاتے ہیں ان میں رکھ رکھاؤ بہت ہے۔ کوئی میلی چیز نہیں لکھتا۔ سب دھو کر استری کر کے پیش کرتے ہیں۔ میں نے خود کو ویسا ہی پیش کرنا چاہا جیسا کہ میں ہوں۔ میں نے علی پور کا ایلی میں سچی باتیں لکھ دیں اور سمجھا کہ بہت بڑا کام کیا بعد میں پتہ چلا کہ یہ بکواس ہے۔ خالی سچ کے زور پر لکھنا بڑی بات نہیں پھر یہ بھی سمجھ میں آیا کہ ہر سچی بات کہہ دینے کے لائق نہیں ہوتی۔

''دراصل میں نے انگریزی ادب پڑھ کر لکھنا شروع کیا تھا اس میں بالکل سچی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے رکھ رکھاؤ کی تحریر کے خلاف احتجاجاً لکھا تھا یہ اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس کتاب کو پسند کریں گے۔ اتفاقاً وہ چل نکلی یوں میں اس چکر میں خواہ مخواہ پھنس گیا اور ابھی تک پھنسا ہوا ہوں۔

ممتاز مفتی نے لبیک میں بہت سے پراسرار واقعات لکھے ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ وہ ان واقعات پر یقین بھی رکھتے ہیں؟ جواب میں مفتی جی نے کہا ''اس میں مَیں نے جھوٹ کچھ نہیں لکھا جو واقعات ہیں وہ مجھ پر بیتے ہیں۔''

دراصل ہماری ۸۰ فیصد زندگی جذبے پر گزرتی ہے۔ والدین اولاد، میاں بیوی، محبوبہ، دوست ان سب رشتوں میں جذبات غالب رہتے ہیں مگر جب ہم بات کریں تو عقل کی کرتے ہیں۔ ہم جذباتی زندگی کو تسلیم نہیں کرتے محض دانشوری کی باتیں کرتے ہیں۔ میں نفسیات کا طالبعلم ہوں لہذا ان باتوں پر نکتہ چینی کرنے کے کام آتی ہے۔ اپنی زندگی میں کام نہیں آتی۔ آپ کسی کے لئے قربانی دیتے ہیں دوستی کرتے ہیں۔ کسی بحران سے نکلتے ہیں تو وہ جذبہ ہے''۔

آج کل ممتاز مفتی قدرت اللہ شہاب کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں ''اللہ

کا سپاہی'' اسے آپ ''شہاب نامہ'' کے سلسلے کی دوسری کتاب سمجھ لیں۔ مفتی جی کے نزدیک اس کی ضرورت یوں محسوس ہوتی ہے کہ کیونکہ اس میں انہوں نے بہت سی باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مفتی جی نے اس بارے میں کہا'' شہاب کی وہ کتاب نامکمل محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے بہت سی باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مفتی جی نے اس بارے میں کہا ''شہاب نامہ میں شہاب نے جھوٹ نہیں بولا لیکن سچ بھی نہیں بولا۔ آخر اس نے وہ باتیں کیوں نہیں لکھیں؟ ممکن ہے بیوروکریٹ ہونے کی وجہ سے ان پر کچھ پابندیاں ہوں لیکن مجھ پر نہیں ہیں لہٰذا انہیں لکھوں گا۔ شہاب نے اپنی کتاب میں ان معجزوں کا ذکر نہیں کیا جو انہیں پیش آئے تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ وہ معجزے دیکھے ہیں۔ کون کرتا تھا یہ مجھے علم نہیں مگر میں یہ جانتا ہوں کہ انہیں ہدایات ملتی تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب میں ''اللہ کا سپاہی'' لکھوں گا تو لوگ مجھے لبیک سے بھی زیادہ گالیاں دیں گے لیکن میں لکھوں گا ضرور۔''

ممتاز مفتی کے نزدیک ادب نہ اسلامی ہوتا ہے اور نہ قومی نہ پاکستانی ادب بس ادب ہوتا ہے۔

اپنے پسندیدہ مصنف اور شاعر کے بارے میں انہوں نے بتایا دوستوفسکی کا اثر آج تک مجھ پر سے نہیں گیا کیونکہ میں اس کے مطابق کوئی چیز ٹھیک طرح سے نہیں لکھ سکا ہوں۔ اسکی یہ بات بالکل سچی ہے کہ انسان ایک وقت میں روتا بھی ہے اور ہنستا بھی ہے۔ انسان دنیا سے بھی وسیع ہے۔ پھر میں کافکا، برٹرینڈ رسل، ہارڈین اور نطشے پڑھا کرتا تھا۔ اردو میں بانو قدسیہ کو پڑھتا ہوں اشفاق کو پہلے پڑھا کرتا تھا اب تو خیر وہ لکھتا ہی نہیں اس کا کہنا ہے کہ لٹریچر کوئی میڈیا نہیں ہے اب صرف ریڈیو اور ٹیلیویژن ہے۔ اس نے ادب کو حقارت سے ٹھکرا دیا لہٰذا ہم اسے ادیب نہیں مانتے۔ منشا یاد کو پڑھتا ہوں وہ اپیل کرتا ہے۔ مظہر الاسلام کو پڑھتا ہوں وہ تو ویسے بھی انسان نہیں دیوتا ہے میں اس کا شخصی خاکہ بھی لکھ رہا ہوں۔ اس میں یہ بات لکھی ہے اس کی تحریروں میں زندگی اور چمک ہے جبکہ منشا یاد کی تحریروں میں زندگی ہے مگر چمک نہیں۔''

ترقی پسند تحریک میں اپنی شمولیت اور علیحدگی کی وجہ بتاتے ہوئے ممتاز مفتی نے کہا

''میں ساری زندگی اس کا مخالف رہا اور اب تک ہوں مَیں اس میں اس وقت شامل ہوا جب اس کے مفہوم کا بھی علم نہیں تھا۔ انہوں نے اصطلاح بڑی اچھی چنی تھی۔ ترقی پسند بس میں شامل ہو گیا مجھ سے کہا گیا مزدور پر کہانی لکھو۔ میں کیوں لکھوں؟ میں مزدور سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ غربت امارت کا فرق قائم رہے گا اور اسے قائم رہنا چاہیئے۔ غربت اللہ کی بڑی دین ہے۔ انسان میں بڑی خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ حد سے زیادہ امارت انسان کو بگاڑ دیتی ہے اسے کبھی خوشی نہیں حاصل ہو سکتی۔

میں نے ایک ایسی کہانی لکھ دی ہے جس میں امیر آدمی قابل ترس انسان ہے۔ اس پر ترقی پسند بہت ناراض ہوئے۔ اس وقت میں سمجھا کہ یہ کوئی ادبی تحریک نہیں بلکہ سیاست ہے کمیونزم ہے۔ انہوں نے مجھے اور منٹو کو بین کر دیا یہ بڑے تگڑے لوگ تھے۔ جب سے ترقی پسندی سے خوف آتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ادب میں بڑا حصہ ہے مگر آپ زبردستی کسی کو ترقی پسند نہیں بنا سکتے کہ مزدور پر کہانی لکھو۔''

ممتاز مفتی کو اپنے ادیب ہونے پر سخت پچھتاوا ہے کہنے لگے ''یہ بالکل بیہودہ کام ہے۔ بیماری ہے۔ آپ ایک دفعہ اس میں پڑ جائیں تو نکل نہیں سکتے۔ بڑے بدنصیب لوگ ہیں۔ جو اس میں آتے ہیں۔ معمولی شہرت کے لئے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ دراصل ذود حسی بڑی ظالم شے ہے۔ میاں بیوی میں ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو پاتی۔ اگر آپ زندگی میں خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میڈیم زندگی بسر کریں۔ شہرت ایک بلیڈ ہے جو خود کو بھی کاٹتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ میں ساری زندگی خود پر قارئین کو فوقیت دیتا رہا۔ اب سمجھ میں آیا کہ قاری اور تماشبین ہونا بہترین حیثیت ہے کاش میں بھی ادیب ہونے کی بجائے قاری ہوتا تو بہت سے دکھوں اور مسائل سے بچا رہتا۔''

ہمیں باتیں کرتے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس روز مفتی جی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے آخری بات اُن سے پوچھی کہ اُس انعام کی کچھ تفصیل بتائیں جو آپ کو لبیک پر ملا تھا۔ ''علی پور کا ایلی'' کو انعام نہ ملنے کے بارے میں تو خاصی باتیں ہو گئیں۔

جواب میں مفتی جی زور سے ہنسے پھر بولے ''ہاں باتیں ہی نہیں بحثیں بھی خاصی ہو

گئیں ویسے انعام ''لبیک'' پرنہیں بلکہ ''ہندیاترا'' پر ملا ہے، یہ اکیڈمی ادبیات نے دیا ہے پتہ نہیں کیوں دیا ہے میں نے تو انہیں کوئی کتاب بھی نہیں دی جب ''علی پور کا ایلی'' کو انعام نہیں ملا تو میں انعام کو بھول ہی گیا۔''

-☆-

مصنف کی دیگر کتب

لبیک	ہند یاترا	اسمارائیں
تلاش	اوکھے اولڑے	گڑیا گھر
ان کہی	اور اوکھے لوگ	گہما گہمی
پیاز کے چھلکے	رام دین	نظام سقہ
گڈی کی کہانی	کہی نہ جائے	ممتاز مفتی کے ڈرامے
غبارے	سمے کا بندھن	مفتیانے (اول)
علی پور کا ایلی	روغنی پتلے	مفتیانے (دوم)
الکھ نگری	چُپ	